نادیہ امین

در کے آستانے

وین سڑک کے کنارے رک چکی تھی۔ بیگ ہاتھ میں تھامے وہ وین سے اتر گئی تھی۔ کچھ دیگر مسافر بھی اترنے لگے تھے۔ انہیں چھوڑ کر وہ قدم بڑھانے لگی تھی۔ دور دور تک لہلہاتے کھیت نظر آرہے تھے۔ سرسوں کی فصل اپنے جوبن پر تھی۔ صبح کی ٹھنڈی سہانی ہوا سرسوں کے ساتھ کھیلتی دیکھنے والی کی نگاہ کو تراوٹ بخش رہی تھی۔

صبح کے سات بج رہے تھے۔ رسٹ واچ پر سے نگاہ

ہٹا کر وہ اس اجلی صبح کے مست نظاروں میں مگن شفاف سڑک پر چلی جارہی تھی۔ علاقہ یہی تھا۔ لیکن اسکول کا درست ایڈریس اس کے پاس نہیں تھا۔

اسے یہی بتایا گیا تھا کہ شکردرہ کے مڈل اسکول میں اس کا ٹرانسفر ہوچکا ہے۔ اب وہ مڈل اسکول اسے خود ڈھونڈنا تھا۔

وہ کافی دور نکل آئی تھی۔ اب اس کی نظریں کسی کی متلاشی تھیں جس سے اسکول کے بارے میں پوچھ سکے۔ لیکن کوئی دکھائی نہ دیا تھا۔ دور دراز کسی کھیت میں اکادکا لوگ نظر آرہے تھے لیکن ان تک پہنچنا شہر تک پہنچنے کے مترادف تھا۔ (یہ خیال سراسر اس کا اپنا تھا) ٹاکرہ ہوا بھی تو بھیڑوں کے گروپ سے۔ جن سے قدرے گھبرا کر وہ پیچھے ہٹ کر "ہش ہش" کہہ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے یہ گروپ اس پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ لیکن اسے کوئی لفٹ نہ دے کر وہ اس کے پاس سے گزرتا کافی دور جارہا تھا۔ کافی پیدل چلنے کے بعد اسے ایک پرانی سی مسجد سے۔ جو سڑک سے اتر کر کچے میدان میں بنائی گئی تھی ایک آدمی نکلتا دکھائی دیا تھا۔ وہ آدمی اس پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر سڑک پر آیا تھا۔ وہ رک کر اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ قریب آ

کروہ بنا دیکھے اس کے پاس سے گزرنے لگا تھا۔ جس پر وہ اسے بے ساختہ آواز دے بیٹھی تھی۔

"سنیے شکر درہ مڈل اسکول کہاں واقع ہے۔" اس آواز پر بنا پلٹے اس نے "میرے ساتھ آؤ۔" کہہ کر قدم بڑھائے تھے۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔ اس نے نوٹ کیا تھا اس آدمی نے ایک بار بھی اس کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ پندرہ منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد اس نے اسی مین سڑک کو تقسیم ہوتے دیکھا تھا۔ دائیں طرف پر ذیلی سڑک پر چلتے اس بندے کی تقلید میں وہ بھی چلی جا رہی تھی۔ کچھ دیر مزید چلنے کے بعد اسے دور سے وسیع رقبے پر پھیلی عمارت کے ساتھ ساتھ یونیفارم میں ملبوس لڑکیاں بھی آتی دکھائی دی تھیں۔ قریب جانے پر اسے مڈل اسکول کا سائن بورڈ نظر آیا تھا۔ کھلے گیٹ میں اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے اس راہ چلتے مرد کو دیکھا تھا۔ جس نے نہ تو پلٹ کر یہ دیکھنے کی زحمت گوارہ کی تھی کہ آیا وہ اندر داخل ہوئی ہے یا نہیں اور نہ ہی اس نے ایک لفظ زبان سے ادا کیا تھا کہ یہی اس کا مڈل اسکول ہے۔ وہ یونہی چلتا گیا تھا۔ دو تین منٹ تک وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں کھڑی اسے یونہی جاتا دیکھتی رہی تھی۔ پھر اگلے ہی پل وہ کندھے اچکا کر عمارت میں داخل ہو گئی تھی۔

اسکول ویسا ہی تھا۔ جیسے دیہات میں ہوا کرتے ہیں۔ یہ تقریباً پانچ کنال پر مشتمل تھا اس میں بارہ کلاس روم اور ایک بہت بڑا برآمدہ تھا۔ اسکول میں ایک اسمبلی اور ایک پلے گراؤنڈ تھا۔ اسٹوڈنٹس کی تعداد مناسب تھی۔ حد سے متجاوز نہیں تھی۔ پہلا دن تو تعارف میں ہی گزرا تھا۔ اسے ساتویں آٹھویں کلاس دی گئی تھی۔ چھٹی کے بعد اسے کسی راشدہ نامی لڑکی کا انتظار تھا۔ جو یہیں کی مکین تھی۔ وہ اس کی دوست کنول کے ماموں کی بیٹی تھی۔ اسے ان ہی کے گھر قیام کرنا تھا۔

کنول پہلے ہی راشدہ کو اس کی آمد کے بارے میں مطلع کر چکی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے اسے بھی راشدہ کا انتظار کرنے کو کہا تھا کہ وہ آکر خود ہی اسے لے جائے گی۔ اسکول آف ہونے کے بعد وہ گیٹ پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ چوکیدار کو اس کا نام بتا کر اس نے اسے بلانے کا کہا تھا۔

"مس جی کوئی راشدہ بی بی آپ سے ملنے آئی ہے۔" وہ جو اس کا انتظار کر رہی تھی بھاگم بھاگ اپنا بیگ اٹھا کر عجلت بھرے انداز میں گیٹ کی جانب روانہ ہوئی تھی۔ چوکیدار اس سے پہلے پہنچا۔ لڑکی کی طرف اشارہ کر کے اس نے اس کی پہچان کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھی تھی۔

"جی میں کنول کی....."

اس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے یکدم سے کہا تھا۔

"جی اس نے کہا تھا کہ آپ مجھے لینے آئیں گی۔"

پھر وہ اسے لے کر اپنے گھر آئی تھی۔ ایک درمیانے سائز کے لوہے کے بنے گیٹ کے اندر داخل ہو کر اس نے صحن میں ایک پینتالیس چھیالیس سالہ عورت کو دیکھا تھا۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی جب ان کی نظریں بیٹی کے ہمراہ اس پر پڑی تو وہ دھلے کپڑوں کی بالٹی چھوڑ کر ان کی جانب لپکتی آئی تھیں۔

"آ گئیں تم بیٹا۔ بہت تھکی ہوئی ہو گی۔ سفر بھی تو کیا ہے نا۔ چل راشدہ بہن کے لیے امرود کا شربت بنا۔" انہوں نے بیٹی کو فٹافٹ شربت بنانے کے لیے بھیجا تھا۔ اور خود اسے لیے صحن میں بچھے تخت کی طرف آئی تھیں۔

"بیٹھو یہاں۔" اس کے پر تکلف انداز کو دیکھ کر وہ ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر بڑے متاسفانہ انداز میں شکایتی نظروں سے دیکھ کر بولی تھیں۔

"ارے بیٹی یہ کیا کرتی ہو۔ یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ اس قدر تکلف اگر کرو گی تو مجھے تو ہرگز اچھا نہیں لگے گا۔ اسے اپنا گھر سمجھو۔ مہمان نہیں ہو تم اب۔" وہ خجل سی ہوتی سر جھکا گئی تھی۔ راشدہ شربت لے کر آ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا کر وہ اس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

"بیٹا تم تو بڑی خوب صورت ہو۔" ان کی بات پر وہ

... بار پھر خجل سی ہو گئی تھی۔ وہ تعریف کر رہی تھیں ... مطلع کر رہی تھیں وہ سمجھ نہ پائی تھی۔

"تمہارا کمرہ اوپر ہے۔ راشدہ تمہیں دکھا دے گی۔ ... کھانے پینے کی فکر مت کرنا اور خبردار جو کچھ خود پکایا تو ... بہت ناراض ہو جاؤں گی۔" ان کے تحکمانہ لہجے پر ... سے مسکرائی تھی۔ پھر وہ راشدہ کے ہمراہ اوپر ... تھی۔ سرخ اینٹوں کا صحن، صحن میں ہی ایک چھوٹا ... کچن، ایک عدد کمرہ اٹیچ باتھ روم، کمرے کے آگے ... برآمدہ، صحن کے سامنے کی دیوار کے ساتھ ترتیب میں ... گملے جس میں رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے ... کونے میں منی پلانٹ کا گملا رکھا گیا تھا جس کی ... دیوار کو ڈھانپی ہوئی تھی۔ اوپر کے سارے پورشن ... کرے پینٹ کیا گیا تھا۔ جبکہ کمرے اور کچن میں ... آف وائٹ پینٹ تھا۔

راشدہ اسے کمرے میں لائی تھی۔ کمرے میں ایک ... ڈبل بیڈ تھا جس پر آف وائٹ چادر بچھی ہوئی تھی۔ ... پر ایک عدد آف وائٹ کمبل بھی نظر آ رہا تھا۔ ایک ... ڈائننگ ٹیبل تھا جو پرانے ماڈل کا تھا۔ کونے میں ... ایک اسٹڈی ٹیبل اور چیئر نظر آ رہی تھی۔ غالباً یہاں ... کوئی "پڑھاکو" رہتا تھا۔ جس کی تصدیق اگلے الفاظ ... ہوئی تھی۔ "یہ کمرہ بھائی کا ہے۔ لیکن اب تمہارا ... کا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جس پر اس ... ایک عدد جوابی مسکراہٹ ارسال کی تھی۔ اسے گھر ... بھی پسند آیا تھا اور اس کے مکین بھی۔ وہ وہاں کچھ ہی ... دنوں میں ایڈجسٹ ہو گئی تھی۔ اس کا اسکول گھر سے ... منٹ کی مسافت پر تھا۔ اسے آنے جانے میں ... کوئی تکلیف نہیں تھی اس لیے بھی وہ یہاں ... مطمئن ہو گئی تھی۔ اسکول دیہی آبادی سے کچھ دور ... پرسکون جگہ پر بنایا گیا تھا۔ جہاں آس پاس ... آبادی نہیں تھی۔ سرسبز لہلہاتے کھیتوں میں ذیلی ... سڑک کے کنارے یہ اسکول واقع تھا۔ اسے یہاں ... آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اس دوران ایک عدد ... خط کے علاوہ اس نے گھر والوں کو تفصیلی حالات سے ... آگاہ نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اس کے لیے ایک خط لکھنا ضروری تھا۔ رات کو ہی اس نے تمام تفصیلات "سب اچھا ہے اور بہترین ہے۔" لکھ کر اس نے انہیں پوری طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

بی اے کے بعد بی ایڈ اور اب ٹیچنگ کی یہ سیٹ نئی تقرری کے ساتھ ہی اسے یہاں لے آئی تھی۔ نئی نئی جاب تھی۔ کچھ کچھ گھبراہٹ اور خوف سا بھی محسوس ہو رہا تھا۔ "پریشانی بڑھانے سے کم نہیں ہوتی۔" کہہ کر خود کو ہمیشہ خود ہی تسلی دیتی تھی۔ خط لکھ کر اس نے راشدہ کے سپرد کر دیا تھا کہ کسی کے ذریعے اسے پوسٹ کروا دے۔ رات کو ہی اسے راشدہ نے خط پوسٹ ہونے کی خوشخبری سنا دی تھی جس پر وہ اس کی بہت ممنون تھی۔ خط اس کے بھائی کے کسی دوست کے ذریعے پوسٹ کیا گیا تھا۔ راشدہ اور رشیدہ سے اس کی اچھی خاصی بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ دونوں بھی اس سے بے حد انسیت رکھتی تھیں۔ ان کا ایک ہی بھائی تھا۔ جو یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ وہ انگلش میں ماسٹرز کر رہا تھا۔ وہ دونوں اپنے بھائی کی گرویدہ تھیں۔ ان کی زبان پر بھائی کے علاوہ کسی اور کا نام نہیں ہوتا تھا۔ اس نے بھائی کی محبت میں اس قدر "دیوانیاں" پہلی مرتبہ دیکھی تھیں۔ وہ ویک اینڈ پر گھر آتا تھا۔ وہ کیسا تھا کیا کرتا تھا۔ اسے کیا پسند تھا۔ کیا ناپسند تھا۔ اس سب سے اسے اچھی طرح آگاہ کر دیا گیا تھا۔ کئی دن تک سلطانہ آنٹی اس کے لیے کھانا بھیجتی رہی تھیں جس پر اسے بہت شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے انہیں کئی بار منع کیا تھا۔ لیکن وہ ناراض ہو جاتی تھیں۔ بعد میں وہ انہیں بہت نرمی سے سمجھا بجھا کر راضی کر چکی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اسے خود پکانے کی اجازت دے دی تھی۔

وہ باقاعدگی سے اسکول جانے لگی تھی۔ اسکول کی پرنسپل بے حد نرم مزاج تھیں۔ کون کس وقت آ رہا ہے جا رہا ہے۔ انہیں کچھ خبر نہ تھی۔ ڈسپلن بھی کوئی چیز ہوتی ہے وہ معصوم اس سے نابلد تھیں۔ ان کا سارا اسٹاف ان سے بہت خوش تھا۔ جبکہ پرنسپل کو اپنے اچھے اخلاق کا فخر کچھ اور "اچھا" بنا گیا تھا۔

وہ سڑک کے کنارے چلی جا رہی تھی۔ جب ایک گاڑی زن سے اس کے پاس سے گزری تھی۔ اس کی نظریں بے اختیار پیچھے مڑ کر نمبر پلیٹ پر جمی تھیں۔ پر وہ نمبر پڑھ نہ پائی تھی۔ وہ نیو ماڈل ٹویوٹا کرولا تھی۔

شام کو وہ نیند سے بیدار ہوئی تو اسے نچلے پورشن میں بہت ہلچل سی محسوس ہوئی تھی۔ کئی بار اس کے دل میں وہاں جانے کا خیال آیا تھا۔ جسے وہ خود ہی جھٹک دیتی تھی۔ اس خیال کو ادھر ادھر بھگانے کے لیے وہ کچن میں گئی تھی۔ تاکہ کچھ پکایا جا سکے اور بوریت سے بچا جا سکے۔ اس نے آلو کے کٹلس اور چٹنی تیار کرنے کا سوچا تھا اور اپنی سوچ پر اس نے فوراً" عمل در آمد شروع کیا تھا۔ کچھ دیر میں دونوں چیزیں تیار کر کے اس نے ایک الگ ڈش میں نکالی تھیں۔ اور ٹرے میں رکھ کر نیچے آئی تھی۔ صحن میں اسے تخت پر کوئی لیٹا نظر آیا تھا۔ اس کا سر سلطانہ آنٹی کی گود میں تھا۔ جبکہ ٹانگیں تخت سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ راشدہ اور رشیدہ غائب تھیں۔ سلطانہ آنٹی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ سلطانہ آنٹی کی نظر اس پر جوں ہی پڑی تو بولیں۔

"آؤ نا رک کیوں گئیں۔" اسے جھجکتا دیکھ کر وہ کچھ متعجب سی ہو گئی تھیں ان الفاظ پر اس لیٹے ہوئے بندے نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر یکدم سے وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی شرٹ کی طرف بڑھا تھا۔ اس کی شرٹ کے اوپری دو بٹن اور آستینوں کے بٹن کھلے تھے۔ وہ سر جھکا کر اپنی شرٹ کے بٹن بند کرنے لگا تھا۔ سلطانہ آنٹی اٹھ کر اس کے قریب گئی تھیں۔ اس کے ہاتھ سے ٹرے لے کر "اس قدر تکلیف کیوں کی۔" کہہ کر کچن میں چلی گئیں۔ جبکہ وہ انگور کے خوشوں پر نظریں جمائے چپ چاپ کھڑی ان کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اٹھ کر اندر چلا گیا تھا۔ اسی وقت اس نے راشدہ اور رشیدہ کو باہر صحن میں آتے دیکھا تھا۔

"بھائی کے لیے کمرہ سیٹ کر رہے تھے۔" وہ اور بھی کچھ بولتی رہی تھیں جس پر اس کا دھیان نہیں تھا۔ اس وقت وہ اپنے بہن بھائیوں کو سوچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد سلطانہ آنٹی ٹرے سمیت واپس آئی تھیں۔ پھر اوپر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ مغرب کی نماز کے بعد اس نے صبح کے لیے اپنے کپڑے استری کیے۔ عشاء کی نماز پڑھ کر اس نے ہاٹ پاٹ سے گرم گرم کٹلس نکال کر کھا لیے تھے۔ رات کو بستر پر دراز ہوتے ہی اس نے "اندلس میں اجنبی" نکال کر پڑھنی شروع کی تھی۔ لیکن اس وقت اس کا ذہن کہیں دور تھا۔ وہ اسے بھول نہیں پا رہی تھی۔ آخر اس میں ایسی کیا بات تھی؟

♥ ♡ ♥

صبح اسکول جانے کے لیے جب وہ نیچے آئی تو وہ اسے پھر دکھائی دیا تھا۔ اس وقت وہ سفید شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے اسے سلام کیا تھا۔ جس کا جواب بہت دھیمے انداز میں دیا گیا تھا۔ وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔ اس کے لباس سے اٹھتی پرفیوم کی مہک اطراف کی فضا کو معطر کر رہی تھی۔ وہ خود لائٹ بلو چکن کے سوٹ میں ملبوس تھی سفید چکن کی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ وہ گھر کے دروازے کو پار کر گئی تھی۔ آسمان پر گھرے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ایک دو بار تو اسے قطرے بھی گرتے محسوس ہوئے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان پر نظریں جمائیں تو اسے کئی رنگ برنگی پتنگیں نظر آئی تھیں۔ کچھ منچلے صبح ہی صبح شغل فرما رہے تھے۔ ایک بیچارے کی تو شاید ہاتھ سے ڈور پھسل گئی تھی۔ پتنگ ہوا کے سنگ لہرانے لگی تھی۔ پھر اچانک ہوا کی رفتار میں تیزی آئی تھی۔ ہوا اس کی چادر اپنے سنگ لے جانا چاہتی تھی کئی بار سر اور شانوں سے پھسلتے پھسلتے رہ گئی تھی۔ اسے اپنی چادر سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ چادر سر سے اتر چکی تھی۔ ہیر بینڈ میں جکڑے بالوں کو ہوا بے ترتیب کرنے پر تل گئی تھی۔ بالوں کی لٹیں جھولنے لگی تھیں۔ وہ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔

وہ آگے جانا چاہتی تھی۔ جبکہ ہوا اسے پیچھے دھکیل رہی تھی۔ تنگ آ کر وہ سڑک کے کنارے بیٹھ گئی تھی۔ بیٹھتے ہی اس کی نظریں بے ساختہ قبرستان میں بیٹھے شخص پر پڑی تھیں۔ ایک لحظہ کو اس نے بھی اس پر نظر ڈالی تھی لیکن کچھ پل بعد اس نے نظریں پھیر کر نیچے گھاس پر جما دی تھیں۔ وہ نادم ہو گئی تھی۔ جبھی یکدم سے اپنی چادر کھول کر ایک بار پھر سے اسے اچھی طرح اوڑھنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ پر وہ کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ وہ وہاں اس وقت تک بیٹھی رہی تھی جب تک کہ ہوا کی رفتار میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اس کی جانب پشت کر کے بیٹھ گیا تھا۔ جوں ہی آندھی چلنا بند ہوئی تھی۔ وہ فوراً" اٹھ کر اسکول کی جانب قدم اٹھانے لگی تھی۔

اس نے اسے اکثر قبرستان میں بیٹھے دیکھا تھا۔ کئی بار وہ اسے صبح مسجد سے نکلتا دیکھ چکی تھی۔ اس دوران اس کی نظر ایک بار بھی اس پر نہیں پڑی تھی۔ اگر پڑی تھی تو اس نے نوٹ نہیں کیا تھا۔

بادلوں نے مسلسل کئی دنوں سے اس علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش سے موسم کافی حد تک خوشگوار ہو گیا تھا۔ آج پہلی بار اس کے دل میں اس علاقے میں گھومنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اس خواہش کو وہ دبا نہیں سکی تھی اس لیے وہ راشدہ اور رشیدہ کے پاس آئی تھی۔ تاکہ ان کے ہمراہ باہر گھوما پھرا جا سکے۔ رشیدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے جانے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ جبکہ راشدہ فٹافٹ تیار ہو کر چل پڑی تھی۔

"اگر آپ کچھ دیر پہلے آ کر کہتیں تو بھائی کے ساتھ چلے جاتے۔ وہ ابھی ابھی باہر نکلے ہیں۔" وہ جواباً" کچھ نہیں بولی تھی۔ بھائی کے بعد راشدہ تھی جس کی عمر بیس برس تھی اور اس کے بعد رشیدہ جس کی عمر تقریباً" سترہ برس تھی۔ رشیدہ راشدہ سے بڑی دکھائی دیتی تھی اس کا اظہار اس نے سلطانہ آنٹی کے سامنے بھی کیا تھا۔ انہوں نے بھی اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

عُمیرہ احمد کا قسط وار

ناول

امربیل

اب کتابی شکل میں شائع
شائع ہو گیا ہے
خوبصورت سرورق، آفسٹ
پیپر، مضبوط جلد، خوبصورت
چھپائی

قیمت ۔۔۔ /400 روپے
ڈاک خرچ ۔۔۔ /30 روپے

ملنے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37
اردو بازار کراچی
فون: 2216361

وہ دونوں باغ میں آئی تھیں۔ باغ میں درختوں میں کچے پکے امرود لگے تھے۔ راشدہ اس کے لیے امرود توڑنے لگی تھی۔ جبکہ وہ ایک ایک درخت کا جائزہ لیتی خود توڑنے کا سوچنے لگی تھی۔ لیکن اپنے ارادے کو وہ عملی جامہ نہ پہنا سکی تھی۔ کیونکہ اس کے لیے مہارت چاہیے تھی جبکہ وہ ماہر ہرگز نہیں تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ باغ کے آخری سرے تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن یہاں آتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ بھی کچھ متحیر سا رہ گیا تھا۔ جبکہ اس کے پاس گھاس پر بیٹھا بندہ سر جھکائے رو رہا تھا۔ وہ جو اس کی پیٹھ تھپک رہا تھا اس کے آنے پر اس کا ہاتھ اس کی پیٹھ پر جم سا گیا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ پھر فوراً" اس نے اپنی نظریں اس روتے شخص پر جمائی تھیں۔ اسے بھی شاید کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ غالباً" اس لیے اس نے سر اٹھا کر پہلے دائیں اور پھر بائیں جانب دیکھا تھا۔ بائیں جانب کھڑی لڑکی کو دیکھ کر اس کی نظروں کا زاویہ بدل گیا تھا۔ وہ سوالیہ انداز میں پاس بیٹھے عباس کو دیکھنے لگا تھا۔ اس کے چہرے سے خود بھی الجھن نمایاں تھی۔ اس نے اس شخص کو اپنے آنسو صاف کرتے دیکھا تھا۔ اس کی نظریں بدستور جھکی ہی رہی تھیں۔ پھر اس کا ہاتھ بالوں میں چلنے لگا تھا۔ ساتھ ہی اس نے سر اٹھا کر دائیں جانب دیکھنا شروع کیا تھا۔ اس وقت فضا پر بوجھل خاموشی چھائی تھی۔ یا ان دو افراد کے بیچ یہ بوجھل خاموشی سارے ماحول کو سکوت میں مبتلا کر گئی تھی۔ آس پاس کے کھیتوں سے ٹریکٹرز لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بہت سے مرد عورتیں کھیتوں میں مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن باغ کے اس گوشے میں بالکل سکوت تھا' سناٹا تھا۔ اس نے اس روتے شخص کو اٹھتے دیکھا تھا۔ وہ عباس سے کچھ کہہ کر جانے لگا تھا۔ اسی اثناء میں راشدہ بھی ان کے پاس گئی تھی۔ بھائی کو دیکھ کر اس نے اس سے امرود توڑنے کی فرمائش کی تھی۔ لمبے قد کے باعث وہ آسانی سے کافی تعداد میں امرود توڑ سکتا تھا۔ بہن کو وہ ٹال نہیں سکا تھا اس نے کئی امرود توڑ کر دیے تھے۔ پھر ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر وہ بھی چلا گیا تھا۔ اس نے ان کے متعلق راشدہ سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اتنا تو وہ جان ہی گئی تھی کہ وہ دوست تھے۔ وہ جس جوش و خروش سے وہاں آئی تھی اتنی ہی خاموشی سے واپس چلی آئی تھی۔

♥ ♡ ♥

دس دن کی چھٹیوں کے بعد وہ واپس یونیورسٹی چلا گیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں وہ بے فکری سے ان کے گھر آتی جاتی تھی۔ ان کے والد پہلے ریلوے میں ملازم تھے۔ لیکن وہاں سے برطرفی کے بعد وہ باہر چلے گئے تھے۔ آج کل وہ بحرین میں ہی ہوتے تھے۔

اس ویک اینڈ پر خود اس کا بھی گھر جانے کا پروگرام تھا۔ جمعہ کی شام سے ہی اس نے اپنا بیگ تیار کر رکھا تھا۔ ہفتے کی شام کو اسے گھر جانا تھا۔ گھر کے تصور سے ہی وہ خوش ہو رہی تھی۔ ہفتے کی شام وہ چھ بجے شہر جانے والی وین کا انتظار کر رہی تھی۔ وین آ گئی تھی۔ لیکن کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ وہ بے بسی سے سڑک کے کنارے کھڑی اپنی بے بسی پر کڑھ کر رہ گئی تھی۔ چھ بجے کے بعد یہاں مسافر گاڑیوں کی آمد و رفت بند ہو جاتی تھی۔ وہ بہت اداس اور ملول ہو گئی تھی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اڑ کر گھر والوں کے پاس پہنچ جاتی۔ ان کی یاد کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ وین چلی گئی تھی۔ جبکہ وہ دور جاتی وین کو حسرت بھری نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔ اس پل اس کی آنکھوں میں بے تحاشا نمی امڈ آئی تھی۔ بیچ سڑک پر رونے کا خیال آتے ہی اس نے فوراً" آنسو صاف کیے تھے۔ بیگ اٹھا کر وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگی تھی۔ پلے گراؤنڈ میں اس قدر شور شرابے سے دور وہ ایک تنہا گوشے میں بیٹھا اس وین کو دیکھ رہا تھا جو اس لڑکی کی آنکھوں میں بے حساب آنسوؤں کے لانے کا باعث بنی تھی۔ اسے خبر تھی کہ دل میں گھر جانے کی کتنی خواہش مچلتی ہے۔ گھر والے کس طرح ایک ایک پل گزار کر آنے والے کی راہ دیکھتے ہیں۔ اس کے درد کو

وہ سمجھتا تھا۔ اس کے درد کو اپنا درد سمجھ کر وہ اٹھ گیا تھا۔ کچے میدان سے نکل کر وہ شفاف سڑک پر بڑے بڑے قدم لیتا اس کے قریب جا رہا تھا۔ پھر تقریباً" دوڑتا ہوا اس کے بالکل نزدیک پہنچ گیا تھا۔

"اپنا بیگ مجھے دو۔" ان الفاظ پر وہ بے ساختہ گردن موڑ کر سکتے کی کیفیت میں کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر یکدم سے نظریں جھکا کر اس کے ہاتھ سے بیگ لے چکا تھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ جھجک گئی تھی۔ وہ اسے جانتی تک نہ تھی تو ایسے کیسے اس کے ساتھ چل پڑتی۔ وہ رکی ہی رہی تھی۔ اسے جھجکتا دیکھ کر وہ پھر سے دھیمے اور ٹھہرے لہجے میں بولا تھا۔

"کچھ فاصلے پر ہی میرا گھر ہے۔ تم باہر سڑک پر انتظار کر سکتی ہو۔ جب تک میں گاڑی نکال لیتا ہوں۔" اسے پتہ تھا کہ وہ اعتبار نہیں کر رہی اس لیے اس نے اسے باہر ٹھہرنے کا ہی کہا تھا۔

"میں نہیں جا رہی ویسے بھی اب کافی دیر ہو چکی ہے۔" اس نے اپنا ہاتھ بیگ کی طرف بڑھایا تھا۔ چند پل اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ چل پڑا تھا۔ وہ جان نہ پائی تھی کہ آخر اس نے اس کا بیگ اس کے حوالے کیوں نہ کیا تھا۔ وہ بھی ناچار اس کی تقلید میں چل پڑی تھی۔ کافی پیدل چلنے کے بعد وہ ایک جگہ رک گیا تھا۔

"تم یہاں میرا انتظار کرو۔ میں گاڑی نکالتا ہوں۔" اس کے چہرے کی زردی مائل رنگت دیکھ کر وہ مزید وضاحت کرتا بولا تھا۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں' میں اپنی بہنیں ساتھ لے لیتا ہوں۔ میرے خیال سے اتنی شیورٹی کافی ہے۔" وہ اس کے بیگ سمیت گیٹ کے اندر غائب ہوا تھا۔ وہ متعجب سی اس کی بات پر سوچتی رہی تھی۔ پھر اس کی نظریں وسیع رقبے پر پھیلی اس عظیم الشان عمارت پر جمی تھیں۔ باہر سے تو تھی ہی شاندار جانے اندر سے کیسی ہو۔ وہ سوچ رہی تھی۔ باغات میں گھری عظیم الشان عمارت یہاں کے مکینوں کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ وہ انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ جب اس نے کسی کو بڑے آہنی گیٹ کو کھولتے پایا تھا۔ وہ چوکیدار تھا۔ گاڑی کو اس کے پاس روک کر اس نے اسے بیٹھنے کو کہا تھا۔ لیکن اسے یونہی جمے دیکھ کر وہ مزید بولا تھا۔

"میری سسٹرز بیٹھی ہیں۔" اسے نظر آ رہی تھیں لیکن جتا کر وہ اسے اچھا خاصا شرمندہ کر گیا تھا۔ وہ عقبی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ ایک لڑکی فرنٹ سیٹ پر تھی۔ بیٹھتے ہی اس نے ایک بار آیۃ الکرسی پڑھی تھی۔ شیشہ چڑھا کر اس نے اے سی آن کر دیا تھا۔ بلیک کلر کی اس گاڑی کو اس نے بارہا سڑک پر آتے جاتے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ گاڑی دراصل اسی بندے کی ہے۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" پاس بیٹھی پندرہ سولہ برس کی لڑکی نے سوال کیا تھا۔ اگلی سیٹ والی اس کے خیال میں زیادہ سے زیادہ اٹھارہ انیس کی تھی۔

"زائرہ۔"

"بہت پیارا نام ہے۔" اس نے تعریف کی تھی۔

"آپ کا نام؟" جواباً" اس نے اخلاقی تقاضا نبھایا تھا۔

"سحر۔"

"آپ کا نام بھی بہت اچھا ہے۔" اس نے بھی سراہا تھا۔

"تھینکس۔" وہ خوش دلی سے مسکرائی تھی۔ کچھ دیر ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی تھی۔ جبکہ اگلی نشست والی اپنے بھائی سے باتوں میں مصروف تھی۔ وہ ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا۔

"آپ انگیجڈ ہیں۔" ایک بار پھر اس نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"نہیں۔" اس نے دھیرے سے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"میری امی آج کل بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہے۔ لیکن بھائی شادی پر رضامند نہیں۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتے۔ اس لیے امی بھی اب تھک ہار کر بیٹھ گئی ہیں۔" وہ شاید بات کرنے کو غیر ضروری موضوع

چھیڑ بیٹھی تھی۔ اگلے پل پھر سے بولی تھی۔

"آپ بہت خوب صورت ہیں۔" وہ شرمائی تھی۔ اس جملے پر بے اختیار اس کے دل سے کلمہ شکر نکلتا تھا۔ اس احساس نے اسے فخر میں مبتلا نہیں کیا تھا بلکہ وہ تشکر میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ گاڑی گاؤں کی حدود سے نکل کر اب کھلے ایریا میں دوڑ رہی تھی۔ ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اندھیرا بڑھتے ہی اس کا خوف بھی بڑھا تھا۔ اسے اپنی حماقت پر شدید افسوس ہونے لگا تھا۔ آخر اسے آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ماں کا کہا جملہ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

"کسی پر جلد بھروسہ ہرگز مت کرنا۔" اور وہ بلا چوں وچرا اس کی بات مان کر اس کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گئی تھی۔ یہ لڑکیاں اس کی بہنیں تھیں یہ تصدیق کس نے کی تھی۔ وہ جھوٹ بھی بول سکتا تھا۔ ایک غیر کی بات مان کر اس پر اس قدر یقین کر لینا سوائے احمق انسان کے کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر زندہ سلامت پہنچی اور ابو کو ساری حقیقت بتاتی تو اسے شدید ڈانٹ سننے کو ملتی۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے۔ "پہلے پرکھو پھر بھروسہ کرو۔" ابو ٹیچر تھے ہر وقت کوئی نہ کوئی نصیحت علمی بات بول ہی دیا کرتے تھے۔ ابو کی یاد کے ساتھ ہی اسے اپنی دونوں بہنوں اور دو چھوٹے پیارے سے بھائیوں کی یاد آئی تھی۔ ایک بہن تھرڈ ایئر میں، دوسری میٹرک میں تھی۔ بھائی جڑواں تھے۔ دونوں کلاس ففتھ میں پڑھتے تھے۔

"ایڈریس۔" اس کی گمبھیر آواز اسے سوچوں کی دنیا سے نکال باہر لائی تھی۔ ایڈریس بتانے کے بعد اس کا دھیان دیہات اور شہر کے موازنے پر لگا تھا۔ رات کے اس وقت شہر میں ہلچل تھی۔ دکانیں کھلی تھیں۔ ریسٹورنٹس کافی بار ہر جگہ لوگ گھومتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے برعکس دیہات میں اس وقت ہو کا عالم ہوتا تھا۔ شروع شروع میں وہ وہاں بہت اکتا جاتی تھی اس خاموشی سے، لیکن بعد میں عادی ہوتی گئی تھی۔

"آپ لوگ واپس جائیں گے۔" اس نے سحر سے پوچھا تھا۔

"نہیں شہر میں ہماری پھوپھی رہتی ہیں ہم ابھی ان کے گھر جائیں گے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ گاڑی ایک چھوٹی سی گلی کے سرے پر رک گئی تھی۔ اس کے اترتے ہی وہ بھی اتر کر اس کے پاس آتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا تھا۔

"میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آؤں گا۔ رات کا وقت ہے اگر تمہیں خوف محسوس ہو رہا ہے تو۔" اس نے مزید مدد کی پیش کش کی تھی جس پر وہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے منع کر گئی تھی۔

"کچھ گھر چھوڑ کر ہی میرا گھر ہے میں چلی جاؤں گی۔" اس کی بات پر وہ پلٹ کر جانے لگا تھا جس پر اس نے اسے آواز دے کر ایک بار پھر اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

"آپ لوگ آئیں میرے ساتھ اگر لوگ اس طرح سے لوٹ گئے تو ابو ناراض ہوں گے۔ کھانا کھا کر جائیے گا۔"

"مہربانی پر دیر ہو رہی ہے۔" وہ معذرت کر کے جا کر گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ گاڑی اس نے فل اسپیڈ میں ہی ڈالی تھی۔

"ایسے نیک لوگ ہزاروں لاکھوں میں ایک ہی ہوتے ہیں۔ وہ بھی ان میں سے ایک ہے۔" وہ سوچتی ہوئی گھر کی جانب قدم اٹھانے لگی تھی۔ ڈور بیل پر انگلی رکھ کر وہ گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔

"اندر شاید سب سو رہے ہیں۔" اس نے غصے اور کوفت سے سوچا تھا۔ پھر ڈور بیل پر انگلی رکھ کر وہ ہٹانا بھول گئی تھی۔ اس وقت تک اس کی انگلی نہیں ہٹی تھی جب تک کہ کسی نے آکر دروازہ نہیں کھولا تھا۔ دروازہ کھولنے والی اسے دیکھتے ہی اس کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔

"ارے اللہ کی بندی آنے تو دو۔" اس نے بھی کھنکتی آواز میں کہتے اسے خود سے ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔

"زائرہ آگئی۔" صبا نے ایک نعرہ بلند کیا تھا۔ پھر اس نے مزید تین چہرے اپنے گرد جمع ہوتے اور پھر لپٹتے دیکھے تھے۔ حمزہ اور تیمور تو اس کی ٹانگوں سے لپٹے "ہمارے لیے کیا لائی ہیں۔" راگ الاپ رہے تھے کہ ابو نے آکر انہیں ہٹایا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے اپنے ہمراہ اندر لائے تھے۔ اندر کمرے میں امی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ بھی اس سے ملی تھیں۔ وہ سب اس کے آنے سے پہلے ہی کھانا کھا چکے تھے۔ اس وقت رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ کھانے کے دوران وہ ماں اور باپ سے باتیں کرتی رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے آنے کی داستان بھی من و عن سنائی تھی۔ حبیب نیازی اس انجانے "فرشتے" کو دعائیں دیتے رہے تھے جس نے ان کی بیٹی کے لیے خود کو اتنی تکلیف دی تھی۔ پھر وہ رات دیر تک اس سے وہاں کے اسکول لوگوں اسٹوڈنٹس، روایات، رسم و رواج کے بارے میں پوچھتے رہے تھے۔ ابو کے ساتھ دیر تک گپ شپ لگانے کے باعث وہ بہن بھائیوں کو وقت نہیں دے پائی تھی جس پر وہ اس سے ناراض ہو کر سو گئے تھے ان کے ساتھ صبح ایک طویل "ٹاکرے" کا سوچ کر وہ خود بھی پرسکون نیند سو گئی تھی۔

♥ ♡ ♥

پیر کی صبح آٹھ بجے وہ واپس آئی تھی۔ گھر سے آتے وقت اس کا دل بہت اداس ہوتا تھا۔ یہ اداسی کئی دن تک طبیعت پر چھائی دل کو بے چین و مضطرب رکھتی تھی۔ لیکن پھر کچھ دنوں بعد چھٹ جاتی تھی۔ وہ صبح ساڑھے سات بجے گھر سے نکلتی تھی اور پونے آٹھ بجے اسکول پہنچ جاتی تھی۔ آج اسے گھر سے نکلنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتی جلد سے جلد اسکول پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگرچہ پرنسپل صاحبہ کوئی سوال جواب نہیں کرتی تھیں۔ لیکن وہ اپنے باپ کی بات پر عمل کرنا کبھی نہیں بھولتی تھی۔ "دوسروں سے صرف اچھی بات ہی سیکھو۔ دوسروں کے اچھے عمل سے سیکھ کر اچھا ر اپناؤ۔ دوسروں کی برائی کو کبھی اپنانے کی کوشش مت کرنا۔" اس لیے وہ صحیح وقت پر ہی اسکول پہنچنے کی کوشش کرتی تھی۔ یوں ہی تیز تیز قدم اٹھاتی وہ قبرستان کے پاس سے گزرنے لگی تھی۔ کہ نگاہ بے اختیار قبروں کے بیچ بیٹھے اس بندے پر پڑی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس لیے اسے نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر رک گئی تھی۔ اور اس کی جانب دیکھنے لگی تھی۔ کسی انجانے احساس کے تحت اس نے بھی نظریں اٹھائی تھیں۔ اسے دیکھ کر اس نے نظریں پھیر کر گھٹنوں کے گرد بازو باندھ کر پھر سے سر جھکا دیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ رو رہا تھا۔ اس نے آج اسے دوسری مرتبہ روتے دیکھا تھا۔ "کیا وجہ تھی؟" وہ سمجھ نہ پا رہی تھی۔ سمجھنا ضروری نہیں تھا۔ لیکن وہ سمجھنا چاہتی تھی۔ کئی بار کے دبے تجسس کو آج وہ مزید دبا نہیں سکی تھی۔ اس نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت دس منٹ رہتے تھے آٹھ بجنے میں۔ یعنی وہ ان دس منٹوں میں اس سے کچھ نہ کچھ پوچھ سکتی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

"آپ کیوں رو رہے ہیں؟" اس سوال پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ وہ ہنوز اسی طرح رو تا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر سے اپنا سوال دہرایا تھا۔ جس پر اس نے سر اٹھا کر اسے خاموش نظروں سے دیکھا تھا اور پھر اپنی آستین سے اپنے آنسو صاف کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے چہرے کو پڑھنے لگی تھی لیکن وہاں صرف سناٹے تھے۔

"تمہیں دیر ہو رہی ہے۔" اس کی بات پر وہ جلدی اٹھ کر چل پڑی تھی۔ وہ غم گو تھا۔ یا دکھی تھا یا اداس۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اس کے دکھ کو جان لینے کا تجسس اس کے اندر بے چینی سے کروٹ لینے لگا تھا۔ وہ کیوں اداس تھا؟ وہ کیوں روتا تھا؟ وہ یہ سب جاننا چاہتی تھی۔ لیکن کیسے۔ یہ کیسے اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد عباس ویک اینڈ پر آیا تھا۔

اس نے کئی باران دونوں کو ساتھ دیکھا تھا۔ اس نے ان دونوں کے بارے میں یا پھر اس شخص کے بارے میں کبھی بھی راشدہ اور رشیدہ سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ وہ ان سے اتنی بے تکلف ہرگز نہیں تھی کہ ان کے پاس بیٹھ کر انہیں ڈسکس کرتی۔ ایک دن اس نے اسے ان کے گھر میں آتے دیکھا تھا۔ سلطانہ آنٹی نے اس کی بڑی خاطر مدارات کی تھی۔ وہ بہت عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ عباس کا انتظار کر رہا تھا جو شاور لے رہا تھا۔ اس نے سرسری نگاہ بھی برآمدے میں بیٹھی زائرہ پر نہیں ڈالی تھی۔ اس وقت وہ لائٹ بلو جینز اور وائٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ عباس بھی تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ وہ بھی جینز پرانی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔

اس کی ماں کی زبانی اسے پتہ چلا تھا کہ وہ دونوں کسی دوسرے شہر جا رہے تھے۔ گھر سے نکلتے وقت عباس اس کی کسی بات پر بے ساختہ مسکرایا تھا۔ اس کی دلکش مسکراہٹ اسے دور سے نظر آئی تھی۔

کچھ دن بعد وہ اسے پھر تنہا اسی جگہ بیٹھا نظر آیا تھا۔ وہ اس کے پاس آئی۔ اسے دیکھ کر وہ اٹھ گیا۔

"میں نے یہاں کے ریسٹ ہاؤس کی بہت تعریف سنی ہے کیا آپ مجھے دکھا سکیں گے وہ جگہ۔" اس کی بات اس شخص کو حیران کر گئی تھی۔ کچھ ساعت بعد وہ بولا تھا۔

"عباس دکھا دے گا۔ اس سے کہہ دینا۔" اس نے ٹالا تھا اسے یہی لگا تھا۔

"وہ تو چلا گیا ہے۔" اس نے تب عام سے لہجے میں کہا تھا۔ اس نے دیکھا تھا اس کی بات پر وہ پل بھر کے لیے کچھ الجھ سا گیا تھا۔

"تم کس وقت جانا چاہو گی؟" اس نے الجھن زدہ حیران لب و لہجے میں سوال کیا تھا۔

"اس سنڈے کو۔" اس کی بات پر اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وہ جانے کے لیے مڑی تھی جیسے ہی کچھ یاد آیا تو پلٹ کر بولی تھی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"یازان۔" کہتے ہی وہ قبر کے سرہانے بیٹھ گیا تھا۔

جاتے جاتے اس نے دیکھا تھا وہ زبانی سورۃ الرحمان پڑھنے لگا تھا۔

سنڈے کے دن ٹھیک صبح نو بجے وہ گھر سے نکلی تھی۔ وہ اسی جگہ پر اس کا انتظار کر رہا تھا اسے دور سے آتا دیکھ کر وہ آگے چل پڑا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ تنہا ہی کسی منزل کا راہی ہو۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے قریب پہنچ کر اس کے برابر چلنے لگی تھی۔

"عباس آپ کا دوست ہے؟"

"ہاں۔" مختصر جواب دیا گیا تھا۔

"بچپن سے۔"

"ہاں۔" اب کی بار بھی بنا دیکھے مختصر جواب دیا گیا تھا۔

"آپ کیوں نہیں پڑھتے؟" اس کی نظریں بجائے سڑک پر ہونے کے اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

"میں پڑھ چکا ہوں۔" وہ نظریں سڑک پر ہی جمائے ہوئے تھا۔

"کیا کوالیفکیشن ہے آپ کی؟" اس کا دھیان اس کی شیو کی جانب منتقل ہوا تھا۔

"انجینئر ہوں۔" وہ حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھنے لگی تھی۔ انجینئر اور اس قدر نکما نکھٹو۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے تاثرات چھپا لیے تھے۔

"جاب نہیں کرتے آپ؟"

"نہیں۔" پھر وہی مختصر جواب۔

"کیوں؟" تفتیش جاری تھی۔

"دل نہیں کرتا۔" اسے اس کی خوش قسمتی پر رشک آیا تھا۔

"کیوں دل نہیں کرتا۔" سوال بہت ذاتی تھا اس لیے اس کا جواب نہیں دیا گیا تھا۔ اس نے بھی بات بدلی تھی۔

"لیکن عباس تو ابھی پڑھ رہا ہے کیا وہ آپ سے چھوٹا ہے؟"

"وہ مجھ سے ایک سال بڑا ہے۔ کچھ گھریلو پرابلمز کی وجہ سے اس کے کچھ سال ضائع ہو گئے تھے۔" اس نے نوٹ کیا تھا۔ اب وہ دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔

شاید اسے اس کی پھولی پھولی سانسوں سے اس کی تھکن کا احساس ہوا تھا۔

"عباس کے صرف آپ ہی دوست ہیں یا اور بھی ہیں۔"

"صرف میں ہی ہوں۔" چالیس منٹ کی مسافت کے بعد اسے دور سے ایک جھیل پہاڑوں میں گھری دکھائی دی تھی۔ جھیل کے کنارے جدید طرز پر بنا ریسٹ ہاؤس دور سے ہی دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ وہ جھیل کے قریب پہنچ گئے تھے۔

اس جھیل کے نیلگوں پانی میں اردگرد سرسبز پہاڑوں کا عکس ایک عجیب حسن تخلیق کر رہا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے انسان پر مدہوشی کی کیفیت طاری کر رہے تھے۔ اس وقت اس نیلگوں پانی کے جھیل کی سطح پر سکوت طاری تھا۔ پانی میں ارتعاش ایک عدد پتھر سے ہی پیدا کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ پتھر اٹھا کر جھیل کے سکوت کو پارہ پارہ کر گئی تھی۔ جھیل کے کنارے اسے بطخیں ٹہلتی نظر آئی تھیں۔ وہ بھی اکتا کر اپنا دل بہلانے آئی تھیں۔ اردگرد کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے گرد ایک چکر لگا کر وہ دونوں جھیل کے کنارے بڑے پتھروں پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اس تمام عرصہ میں وہ ایک بار بھی نہیں بولا تھا۔

"آپ اس قدر اداس کیوں ہیں؟" کئی دنوں کا لبوں پر مچلتا سوال اس کی زبان پر آ ہی گیا تھا۔ اس کی بات پر وہ چونک اٹھا تھا۔ لیکن دوسرے ہی پل وہ سنبھل گیا تھا۔ مگر بولا کچھ نہیں تھا۔

"میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔" اس نے کریدا تھا۔

"میں جواب دینا نہیں چاہتا۔" اس نے دھیمے اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا تھا۔

"کیوں؟" اس کی امید ٹوٹنے لگی تھی تب ہی پوچھ بیٹھی تھی۔

"مجھے نہیں پتہ۔" وہ اپنی پرسوچ نگاہیں دور خلا میں مرکوز کرتے بولا تھا۔

"عباس کی طرح آپ مجھ پر بھی بھروسہ کر سکتے ہیں۔" اس کے الفاظ پر اس نے پل بھر اس کے چہرے پر نظر جمائی تھی لیکن پھر نظروں کا زاویہ بدل کر وہ دوڑتی بھاگتی بطخوں کو دیکھنے لگا تھا۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔" وہ حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھی۔

"عباس کی طرح تم مجھے سمجھ نہیں سکتیں۔" اب کی بار اس نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"عباس سے زیادہ میں آپ کو سمجھ سکتی ہوں آپ اس پر یقین رکھیں۔" اس کا لہجہ عام تھا۔

"اگر مجھے جان گئیں تم، تو شاید مجھے سمجھنے پر پچھتانے لگو۔" وہ اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں نہیں پچھتاؤں گی اس بات کا بھی میں آپ کو یقین دلاتی ہوں۔" اس کے اٹل لہجے پر وہ اٹھ گیا تھا۔ وہ بھی متعجب سی اٹھ گئی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر چلنے لگا تھا۔ وہ اس کی تقلید میں چل پڑی تھی۔

"تم مجھے ٹال رہے ہو۔" اس نے تکلف کی دیوار گرا دی تھی۔

"عباس سے پوچھ لینا۔" اس نے اسے کہتے سنا تھا۔

"عباس سے نہیں میں تم سے سننا چاہتی ہوں۔ ہر کسی کی بات فوراً سمجھ میں نہیں آتی۔ کسی کسی کی بات ہی بندہ جلد سمجھ لیتا ہے۔ چونکہ یہ بات تمہاری ہے تم ہی مجھے بہتر طور پر سمجھا سکتے ہو۔" وہ یکدم اس کی طرف پلٹتا بولا تھا۔

"تم کیوں جاننا چاہتی ہو؟" اس کے سوال نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔

"میں نہیں جانتی۔" اس کی دھیمی آواز پر وہ مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے پھر سے چل پڑا تھا۔ باقی راستہ وہ دونوں خاموش ہی رہے تھے۔

♥ ♡ ♥

وہ رشیدہ کے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی ہانک رہی تھی

۔ جبکہ سلطانہ آنٹی مشین رکھے کپڑے سی رہی تھیں۔ ان کی باتوں کے دوران وہ بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہی تھیں۔ راشدہ الگنی پر سے سوکھے کپڑے اتار کر اندر کمرے میں لے گئی تھی۔ چلتے پھرتے وہ بھی کوئی نہ کوئی لقمہ دے ہی جاتی تھی۔

"چل باتیں ختم کرو اور پائپ لگا کر پودوں کو پانی دو۔" راشدہ نے تکان بھری آواز میں رشیدہ سے کہا تھا اور ان کے قریب بیٹھ گئی۔ راشیدہ کی کسی بات پر وہ ہنس پڑی تھی۔ وہ ہنوز ہنسے جا رہی تھی جب عباس گھر میں داخل ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی ماں کپڑے وپڑے چھوڑ کر بڑے جوش و خروش سے اس کی جانب لپکی تھیں۔ راشدہ نے بھاگ کر اس کے ہاتھ سے بیگ لیا تھا۔ رشیدہ پائپ چھوڑ کر بھاگ کر اس کے گلے لگی تھی۔ وہ دلکش انداز میں مسکراتا رہا تھا۔ اس نے بھی اٹھ کر اسے سلام کیا تھا۔ جسے اس نے خوشگوار موڈ میں وصول کیا تھا پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ راشدہ کے کمرے میں آ گئی تھی ادھر ادھر کی باتوں کے دوران وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔

"راشدہ' امی پوچھیں تو کہنا کہ میں یازان کی طرف گیا ہوں۔" عباس کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر وہ کچھ نروس سی ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" لیکن پھر یکدم سے اس نے پلٹتے عباس کو پکار کر کہا تھا۔

"یازان کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"فی الحال تو ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی جا کر معلوم ہو جائے گا ہاسپٹل کے بعد میں اس سے نہیں ملا۔" یہ کہتے ہی وہ چلا گیا تھا۔ اس کی بیماری کا سن کر وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئی تھی۔ راشدہ' کچھ کہہ رہی تھی جس پر اس کا دھیان نہیں تھا۔

"بھائی کا دوست ہے۔ اسی گاؤں میں رہتا ہے۔ ایک بار تمہاری موجودگی میں بھی آیا تھا نا۔" وہ اسے یاد دلاتی بولی تھی۔

"وہ پچھلے کچھ عرصے سے بیمار ہے۔ امی بتا رہی تھیں۔ پوچھنے بھی گئی تھیں۔" وہ کپڑوں پر استری کرتے اسے جھکے سر سے بتا رہی تھی۔

"اس کے دادا ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں اور والد پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ایس پی کے عہدے پر تعینات ہیں۔ دو چچا انکم ٹیکس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ دوسرے نمبر کے چچا کے پٹرول پمپ ہیں۔ ان کی اپنی بیوی کے ساتھ ....." ماں کے آنے پر بات ادھوری رہ گئی تھی۔

"تم جاؤ فی الحال چھوڑ دو یہ کپڑے۔ سکینہ قرآن پڑھنے آئی ہے اسے پڑھاؤ۔ رشیدہ تمہارے چچا کے ہاں گئی ہے۔" وہ استری کا پلگ نکال کر اٹھ کر چلی گئی تھی۔ وہ جو بات بتانے جا رہی تھی۔ ادھوری رہ گئی تھی۔ وہ بھی اٹھ گئی تھی۔

"تم کہاں چل دیں بیٹھو وہ ابھی آ جائے گی۔"

"نہیں مجھے بھی کچھ کام ہے۔ اب اگر مزید بیٹھی تو دیر ہو جائے گی۔"

وہ اس کے بارے میں عباس سے پوچھ سکتی تھی۔ لیکن وہ نہیں پوچھ سکتی تھی۔ اس کی شخصیت کچھ اس قسم کی تھی۔ کہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے آج تک اس سے غیر ضروری بات نہیں کی تھی۔ تو وہ کیسے اس سے ایک غیر مرد کے بارے میں سوالات کر سکتی تھی۔ جسے وہ جانتی تک نہیں تھی۔ یہ حرکت اسے عباس کی نظروں میں گرا سکتی تھی اور وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔

کچھ دن بعد اس نے ان دونوں کو شام کے وقت پانی کے بہت بڑے نالے کے کنارے بیٹھے دیکھا تھا۔ اس نالے سے کھیتوں کو سیراب کیا جاتا تھا۔ وہ اکیلی ہی نکلی تھی۔ وجہ اس کی اسٹوڈنٹ تھی جس کے پر زور اصرار پر وہ ان کے گھر جا رہی تھی۔ اس کی فیملی نے اسے چائے پر بلایا تھا۔ اس بچی کی خاطر وہ مان گئی تھی ورنہ اس کا دل وہاں جانے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ دونوں اسے پاس سے گزرتے دیکھ کر اپنی نظریں جھکا گئے تھے۔ لیکن وہ رک گئی تھی۔ اس کی نظریں یازان پر تھیں۔ اس وقت بھی اس کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی زردی اس کی بیماری کی

غمازی کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد بڑے گہرے سیاہ حلقے نظر آ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بے رونق اور مرجھائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اس کے لب بالکل سفید تھے۔ جیسے اس کے لبوں سے سرخی نچوڑ لی گئی ہو۔ کیا بیماری تھی؟ کیا مسئلہ تھا؟ وہ سوچتی ہوئی آگے بڑھی تھی۔ اسے اپنے قریب آتا دیکھ کر وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔ لیکن بدستور خاموش ہی رہے تھے۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" اس کے سوال نے دونوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ وہ عباس کو تحیر بھری نظروں سے دیکھ کر نظریں جھکا گیا تھا۔ جبکہ عباس کو اپنی حیرت چھپانے میں کمال حاصل تھا۔ اس لیے وہ بالکل نارمل ہو گیا تھا۔ ایک سرسری نگاہ عباس پر ڈال کر وہ یازان سے ایک بار پھر مخاطب ہوئی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ تمہاری طبیعت اب بھی ٹھیک نہیں ہے۔" اب کی بار اس نے جواب دینے میں تامل نہیں کیا تھا۔

"ٹھیک ہوں میں۔" پھر وہ خاموش کھڑے عباس کو دیکھ کر بولا تھا۔

"میں گھر جا رہا ہوں۔ کل صبح میری طرف آ جانا۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے اپائنمنٹ ہے میرے ساتھ پھر وہاں شہر چلے جائیں گے۔" اس کی سنجیدہ آواز اطراف کے سناٹے کو چیر رہی تھی۔ یہ کہتے ہی وہ ان دونوں کو چھوڑ کر چل پڑا تھا۔ ایک لحظہ کو عباس پر نگاہ ڈال کر پھر وہ یکدم سے مڑ کر اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔ عباس کچھ دیر تک کھڑا ان دونوں کو دیکھتا رہا تھا اور پھر گھر کی جانب مڑا تھا۔

"تمہیں کیا ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے کیا تکلیف تھی؟" اس نے اپنے پاس ایک بار پھر اس لڑکی کی آواز سنی تھی۔

"بخار تھا۔" شاید اس نے ٹالا ہے وہ سوچ رہی تھی۔

"صرف بخار۔" اسے یقین نہیں آیا تھا۔

"کیا کینسر ہو جاتا؟" وہ عام سے لہجے میں کہتا بالکل سیدھ میں دیکھے جا رہا تھا۔ جبکہ اس کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ یکدم سے پیر کے نیچے پتھر آیا تھا۔ وہ گرنے لگی تھی جب اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے گرنے سے بچایا تھا۔ پھر فوراً ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"سوری میں ....." وہ خجل ہو گئی تھی۔ اس نے جواباً کچھ نہیں کہا تھا۔

"تم ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھے؟" ایک بار پھر اسے بولنے پر اکسایا گیا تھا۔

"ہاں۔"

"کتنے دن؟"

"چھ دن۔" اسے ذخیرہ الفاظ کی ضرورت تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔

"عباس تم سے ملنے ہاسپٹل آتا رہا تھا؟"

"ہاں۔" پھر مختصر جواب۔

"تبھی اسے معلوم تھا تمہاری بیماری کے متعلق۔" وہ سر ہلاتی بولی تھی۔

"تمہیں پتہ ہے تم کیوں بیمار تھے؟" اس کے سوال پر وہ بے اختیار رک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

"تم ڈیپریشن کی وجہ سے بیمار ہوئے تھے۔ ڈیپریشن سے پیچھا چھوٹے گا تو تم خود بخود ٹھیک ہو جاؤ گے۔" وہ اچانک رک گیا تھا۔

"مجھے کیا ڈیپریشن ہے تم جانتی ہو۔" وہ اب سینے پر ہاتھ باندھ کر اس کے بالکل سامنے کھڑا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا تھا۔

"میں جان جاؤں گی جب تم بتاؤ گے۔" وہ بھی اس کی آنکھوں میں ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کا لہجہ یقینی تھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ میں تمہیں بتا دوں گا۔" وہ اس کے یقین کو آزمانا چاہتا تھا شاید۔

"ہاں جب میں پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔ تو تم خود بخود مجھے بتا دو گے کہ تم کیوں ڈیپریس ہو۔" وہ تب سرسری لہجے میں کہتی اطراف کا جائزہ لینے لگی تھی۔

"جان کر تمہیں کیا ملے گا؟" وہ اسے بغور دیکھتا بولا تھا۔

"نہ بتا کر تمہیں کیا ملے گا؟" ایک بار پھر وہ اس کی

آنکھوں میں دیکھتی بولی تھی۔

"عباس سے پوچھ لینا۔" یکدم سے کہتا وہ اسے بہانہ بناتا محسوس ہوا تھا۔

"تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ میں عباس سے تمہارے متعلق بات کروں گی۔" اس کی بات پر اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا تھا۔ جسے پاس کھڑی لڑکی نے محسوس کیا تھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا جبھی فوراً" بولی تھی۔

"میں کچھ غلط کہہ چکی ہوں۔" وہ خاموشی سے چل پڑا تھا۔ وہ بھی چل پڑی تھی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟ عباس تو گھر چلا گیا ہے۔ تم اس کے ساتھ کیوں نہیں گئیں۔" وہ بات بدل گیا تھا۔

"میری ایک اسٹوڈنٹ نے آج مجھے اپنے گھر چائے پر انوائٹ کیا ہے۔ میں ادھر ہی جا رہی تھی۔ تمہارے گھر سے کچھ آگے ان کا گھر ہے۔ شاید کوئی سرور نام بتا رہی تھی اپنے والد کا۔" وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے نام یاد کرتے ہوئے بولی تھی۔ اس کی بات پر وہ رک کر اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"گھر جاؤ ان کے گھر جانے کی ضرورت نہیں۔" وہ شدید حیرت میں کھڑی اس کے الفاظ پر غور کرنے لگی تھی۔

"تم سے کہہ رہا ہوں میں گھر جاؤ۔" اس نے کچھ سخت لہجے میں کہا تھا۔

"لیکن انہوں نے مجھے انوائٹ کیا ہے۔ اگر میں وہاں نہ گئی تو بری بات ہو گی۔"

"کہہ رہا ہوں نا تم سے کہ گھر جاؤ۔" وہ نا سمجھی کی کیفیت میں گھری پلٹ کر جانے لگی تھی۔ کچھ دور جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ اپنے گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا۔ وہ بھی واپسی کی راہ پر ہو لی تھی۔

♥ ♡ ♥

وہ جمعہ کی خوشگوار صبح تھی۔ ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ دھند نے ہر چیز کو دھندلا کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے دھند چھٹتے دیکھی تھی۔ ہر منظر صاف واضح ہونے لگا تھا۔ اسے راستے میں کئی اسٹوڈنٹس ملی تھیں جنہوں نے اسے سلام کیا تھا۔ کئی ایک اس سے بات کرنے کے چکر میں اس کے برابر چل رہی تھیں۔ وہ ان سے ہلکی پھلکی باتیں کرتی راستہ کاٹ رہی تھی۔ قدم اس وقت جمے تھے جب اس نے دور سے یازان کو مسجد سے نکل کر قبرستان جاتے دیکھا تھا۔

"آپ لوگ جائیں میں آتی ہوں۔" اس نے انہیں ٹرخایا۔

وہ "جی ٹیچر" کہتی چلی گئی تھیں۔ وہ کچھ دیر کے لیے وہیں کھڑی رہی تھی۔ پھر اس کے قدم خود بخود قبرستان جانے والی راہ پر پڑ گئے تھے۔ وہ اس کی جانب پشت کیے بیٹھا تھا۔ قریب جانے پر اس نے دیکھا تھا وہ ایک قبر کے سرہانے بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ کچھ قدم وہ مزید آگے بڑھی تھی۔ اب وہ اس کی پشت پر کھڑی واضح طور پر اس کی آواز سن رہی تھی۔ اٹھ کر وہ جونہی پلٹا تھا اسے دیکھ کر آنکھوں میں امڈ آتے تحیر کو خود ہی نظر انداز کر کے وہ دھیرے دھیرے قدم رکھتا قبرستان سے نکلنے لگا تھا۔ وہ بھی اس کے ہمراہ چل پڑی تھی۔

"تمہیں نہیں معلوم کہ قبرستان میں عورتوں کا آنا منع ہے۔" وہ تب خجل ہو گئی تھی۔ اس نے کئی بار سنا تھا لیکن عمل کرنا بھول جاتی تھی۔

"آئندہ یہاں مت آنا۔" اس نے مزید کہا تھا۔

"میں تمہارے پاس آئی تھی۔" اس نے وضاحت دینی چاہی تھی۔

"تم قبرستان میں آئی تھیں۔ باہر رک کر بھی میرا انتظار کر سکتی تھیں۔" وہ مزید شرمندگی سے دوچار ہوئی تھی۔ وہ دونوں قبرستان سے باہر آئے تھے۔

"تمہیں اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔ تم کس لیے میرا پیچھا کرتی ہو اس کی وجہ صرف مجھے معلوم ہے۔ باقی لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ اگر جان بھی لیتے ہیں تو اسے قطعاً" کوئی اہمیت نہ دے کر اپنی سوچی بات کو اصل وجہ قرار دیں گے۔ اس لیے احتیاط کرو۔" آج وہ اسے مسلسل شرمندہ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت خفت سے سرخ پڑ گئی تھی۔ اس کے شرمندہ

[illegible] پر ایک نگاہ ڈال کر وہ بہت دھیمے لہجے میں بولا

"میں آج شام ریسٹ ہاؤس پر تمہارا انتظار کروں گا۔ شام چھ بجے وہاں آجانا۔" یہ کہتے ہی وہ اس کے پاس سے گزر کر چلا گیا تھا۔

شام چھ بجے وہ صحیح وقت پر وہاں پہنچی تھی۔ وہ وہاں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت سورج کی مدھم کرنوں سے جھیل کا پانی ایک عجیب سنہری رنگت اختیار کر گیا تھا اس نے دور دو لڑکوں کو مچھلیاں پکڑتے دیکھا تھا۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف پرواز اندھیرا ہونے سے پہلے پہنچنے کی سعی میں تھے۔ ان کے جھنڈ کے جھنڈ اڑان کے مزے لوٹتے نظر آ رہے تھے۔ آزاد فضاؤں کے آزاد پنچھی۔

"میں ڈیپریس ہوں تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں شدید ڈیپریشن کا شکار ہوں اس کا اندازہ تمہیں نہیں ہے۔" اس کی گمبھیر آواز اس کی توجہ کھینچ کر اسے دیکھنے پر مجبور کر چکی تھی۔

"کیا ڈیپریشن ہے تمہیں؟ کیا تمہارے ماں باپ نہیں ہیں۔" اس کے خیال میں شدید ڈیپریشن کی یہی وجہ ہو سکتی تھی۔

"نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔" اس نے گردن نفی میں ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"تو پھر کیا وجہ ہے کیا کسی سے محبت کرتے تھے؟" وہ [illegible] ٹھہرے ہوئے انداز میں بات کر رہی تھی۔ اس سوال پر اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔ یقیناً" کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ لیکن اس کے اگلے جملے نے اسے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کر دیا تھا۔

"میں کسی سے نفرت کرتا تھا۔" کرتا تھا ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اب نہیں ہے۔

"کون تھا وہ۔" اس کی حیرت میں ڈوبی آواز ابھری تھی۔ اس کی نگاہیں اس کے چہرے پر سے ہٹ کر اس کے آنسوؤں پر جمی تھیں۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ بولنا چاہتا ہو لیکن بول نہ پا رہا ہو۔

"یازان کون تھا وہ؟" اس کی نرم آواز پر نمی بہنے لگی تھی۔

"یازان تم بعد میں بھی رو سکتے ہو پہلے مجھے بات بتاؤ۔" وہ ہنوز روئے جا رہا تھا۔ جانے کتنی دیر تک وہ روتا رہا اور وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔

"میری کزن تھی۔" بالآخر اس نے جواب دے دیا تھا۔ اگرچہ جواب سننے کے لیے اسے طویل انتظار کرنا پڑا تھا۔

"کیا نام تھا اس کا؟" وہ ہاتھ میں ڈسٹر لیے دھیرے دھیرے اس کے ذہن پر چھائی ڈسٹ کو صاف کرنے کی شروعات کر چکی تھی۔

"شعوانہ۔"

"کیا ہوا تھا اسے؟ میرا مطلب ہے کیا اس کی ڈیتھ ہو چکی ہے؟"

"نہیں۔" اس کی بھیگی بھیگی نظریں جھیل کے پانی پر جمی کسی گہری سوچ میں ڈوبی تھیں۔

"تو پھر کہاں......" وہ الجھن میں پڑ گئی تھی۔

"اسے میں نے قتل کیا تھا۔" اس کے جملے نے اس کے اعصاب پر ایک زوردار ضرب لگائی تھی۔ وہ شدید حیرت میں گھری آنکھیں پھاڑے اسے ناقابل یقین نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ دوسرے ہی پل غصے کی ایک لہر اس کے تن بدن میں بھڑک اٹھی تھی۔ اس نے تب برہم لہجے میں کہا تھا۔

"کیوں؟" اس کی تیز اور برہم آواز پر وہ اچانک اس کی طرف دیکھ کر سر جھکا گیا تھا۔

"میں نے کہا نا میں اس سے نفرت کرتا تھا۔" اس کے جملے پر اسے بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ اس کے غصے کا اظہار اس کے الفاظ سے ہونے لگا تھا۔

"اس وقت مجھے تم سے شدید نفرت محسوس ہو رہی ہے "تو کیا میں بھی تمہیں جان سے مار دوں۔" اس کے طنزیہ جملے پر اس نے ذرا کی ذرا اسے دیکھا تھا لیکن پھر فوراً" آستین کو ہٹا کر اس نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تھی۔ اس وقت کیا بج رہا تھا اسے بالکل بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔

"کیا وقت ہو رہا ہے؟" اس کی تلخ آواز اس کے پاس ابھری تھی۔ وہ اس کی غائب دماغی نوٹ کر چکی تھی۔ صرف اور صرف اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کے لیے اس نے اس وقت ٹائم پوچھا تھا۔

"پتہ نہیں۔" اس کے دوبارہ دیکھنے پر وہ بخوبی جان سکتی تھی کہ وہ ٹائم نہیں نوٹ کر پایا تھا۔ اس لیے اس نے سچ بول دیا تھا۔ لیکن اس نے اس پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا۔ اس کے حسین چہرے کے پیچھے بھیانک چہرہ نظر آتے ہی وہ جیسے خود پر کنٹرول نہ کر پائی تھی۔ تب ہی تلخ لہجے میں کہتی گئی تھی۔

"تمہیں ڈیپریشن ہونا چاہیے۔ سوری۔" کچھ پل بعد وہ چونکنے کا مظاہرہ کرتی بولی تھی۔ "اب میں ڈیپریشن کا لفظ ہر گز استعمال نہیں کروں گی۔ اس کے لیے میں ندامت، پچھتاوا، شرمندگی کے الفاظ استعمال کروں گی۔ تمہیں ندامت ہونی چاہیے۔ ہر وقت ہونی چاہیے۔ میرے خیال سے جو کچھ تم محسوس کرتے ہو وہ بہت کم ہے۔ تمہیں ہر وقت رونا چاہیے۔ ہر وقت ماتم میں رہنا چاہیے کہ تم نے ایک انسان کا خون کیا ہے۔ وجہ کیا تھی؟ نفرت۔" وہ تیزی سے بولی تھی۔ "وجہ نفرت تھی۔ اس قدر بڑی وجہ پر تو قتل کرنا بجا تھا۔ لیکن اب جب کر ہی چکے ہو تو پچھتاوا کیوں ہونے لگا تمہیں۔" پھر نہایت سخت لہجے میں بولی تھی۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں۔ چاہتے ہو کہ پچھتاوا بھی نہ ہو تمہیں۔" پھر نہایت دوستانہ انداز میں اسے تسلی دیتی بولی تھی۔ "ویسے میں ایک بات کہوں۔ تم ایک باضمیر انسان ہو۔ کم از کم اتنا احساس تو ہے ہی تمہیں کہ تم ایک عدد خون کر چکے ہو۔ اس لیے میرے خیال سے تم معاف کر دیے جاؤ گے۔ جہنم سے بچ جاؤ گے۔" اس نے اپنی ساری زندگی میں اس قدر طنزیہ جملے کبھی نہیں سنے تھے۔ لیکن چونکہ وہ طنز نہیں سچائی تھی اس لیے وہ بڑی خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔ پھر مزید مشورہ مفت دیتی کہنے لگی تھی۔

"تم جو دو چار بار روتے ہو نا میری مانو تو دن رات رویا کرو۔ بخشش طلب کیا کرو۔ دو چار آنسو ندامت کے اس گناہ کو مٹا نہیں سکیں گے۔" وہ اس کے چہرے کو دیکھنے لگا تھا جو غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔

"حیرت ہے بھئی۔" وہ آنکھوں اور لہجے میں تحیر لیے خود سے بولنے کے انداز میں کہنے لگی تھی "لوگوں کے لیے قتل کرنا کس قدر آسان ہوتا ہے۔ انسانی جان کس قدر بے قیمت بے مول ہو کر رہ گئی ہے۔" پھر یکدم سے اس کی طرف دیکھتی برہم آواز میں بولی تھی۔ "قتل کرنے کے بعد بھی سکون چاہتے ہو۔ ہر وقت فائدے کا سوچنے والا بھلا کیسے بے سکونی کو ہنسی خوشی برداشت کر سکتا ہے۔ میرا نیک اور مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ تم آج سے وہ تمام سکون آور ادویات استعمال کرنا ترک کر دو جو تمہیں تمہارا ڈاکٹر ایڈوائز کر چکا ہے۔ یہ جو دو چار آنسو بہا لیتے ہو۔ یہ اس دوا کے ساتھ خشک ہی نہ ہو جائیں یہاں تو گزر جائے گی۔ پر موت کے بعد وہاں گزارنی مشکل ہو جائے گی۔" شدید اشتعال کے عالم میں کہتی وہ اٹھ گئی تھی۔ وہ اسے بیمار سمجھتی رہی تھی۔ یا کوئی خاندانی پریشانی۔ یہاں تو قتل کر کے سکون کی تلاش کی جا رہی تھی۔ بے سکونی بھی برداشت نہیں کر سکتے یہ لوگ۔ قتل جیسے گناہ کبیرہ کے بعد اور قتل بھی کس لیے۔ نفرت تھی اس لیے نفرت تو اسے بھی بہت سے لوگوں سے ہے تو کیا نفرت کے لیے ہر ایک دوسرے کی گردن کاٹنے لگے گا۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ ڈیپریشن نہیں ندامت تھی۔ پچھتاوا تھا۔ اس کے پاس اس قدر فالتو وقت نہیں تھا کہ ایک قاتل کے ساتھ بیٹھ کر اس کے دو پل کے ندامت بھرے جملے سن لیتی۔ اس لیے وہ اٹھی تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" اسے اپنے پیچھے اس کی آواز سنائی دی تھی۔ "مجھے جانا ہے ہو سکتا ہے کہ تم میری زبان سے کسی غلط لفظ نکلنے پر مجھے قتل کر دو۔ اس لیے میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔" جاتے جاتے بھی وہ طنز سے باز نہیں آئی تھی۔

گھر آ کر بھی اس کا دماغ خراب ہوتا رہا تھا۔ اتنے عرصے فضول میں وہ مغز کھپاتی رہی تھی۔ وہ چلی تھی

اس کا پرابلم حل کرنے۔ اسے حیرت عباس پر ہو رہی تھی۔ اسے ضرورت کیا تھی اس قاتل کے ساتھ دوستی کرنے اور نبھانے کی ہو سکتا تھا کہ ایک دن وہ بھی اس کی نفرت کا شکار ہو کر قتل ہو جائے۔ ایسا سوچتے ہی اسے بے ساختہ جھرجھری آئی تھی۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ "اللہ نہ کرے" کے الفاظ نکلے تھے۔ اس تلخ ملاقات کے نقوش کچھ دن تک اس کی طبیعت پر چھائے رہے تھے۔ لیکن کچھ دنوں بعد وہ "میری بلا سے" کہہ کر خود کو ریلیکس کر چکی تھی۔

♥ ♡ ♥

رات کو وہ کچن میں دال چاول بنا رہی تھی۔ راشدہ اسے ڈھونڈتی ہوئی کچن میں آئی تھی۔

"واہ کیا خوشبو ہے۔" وہ مسکرائی تھی۔

"کچھ دیر بعد کہو گی واہ کیا ذائقہ ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے چاول دم پر رکھ کر اس کے ہمراہ باہر صحن میں آئی تھی۔ پھر دونوں نے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔ برتن دھو کر کچن صاف کر کے وہ واپس اس کے پاس آئی تھی۔ کافی دیر تک ان کے درمیان بات چیت ہوتی رہی تھی۔ بات سے بات چلی تو کچھ اور ہی رخ اختیار کر گئی تھی۔ ساری جھجک کو پس پشت ڈال کر اس نے راشدہ سے کہا تھا۔

"یازان نے اپنی کزن کو کیوں قتل کیا تھا۔" اس کی بات پر اس نے حیرت سے منہ کھول کر بڑے پر زور انداز میں گردن نفی میں ہلا کر کہا تھا۔

"یازان نے قتل کیا۔"

"ہاں۔" وہ کچھ سمجھ نہ پائی تھی۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" وہ الٹا اسی سے سوال کرنے لگی تھی۔

"پتہ نہیں میں یہ بھول گئی۔ میں نے کسی سے سنا تھا۔" وہ اصل بات چھپا گئی تھی۔

"نہیں جس نے بھی کہا ہے جھوٹ بولا ہے۔ یازان بھائی نے قتل نہیں کیا اسے۔ اس نے تو خودکشی کی تھی۔" اس کی بات پر وہ گم صم ہو گئی تھی۔

"خودکشی۔" کچھ پل بعد وہ حیرت میں گھری بولی تھی۔

"ہاں خودکشی۔" وہ اس کے چہرے پر چھائی حیرت کو بڑے غور سے تک رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے کہ تمہیں صحیح طرح سے پتہ نہ ہو۔" اس نے اب بھی یقین نہیں کیا تھا۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ میں یہاں رہتی ہوں۔ مجھے خبر نہ ہو گی۔" کچھ پل بعد وہ بولی تھی۔

"ٹھیک ہے آپ کسی سے بھی پوچھ لیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے غلط سنا ہو۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ کسی نے مذاق کیا ہو آپ کے ساتھ۔ بہرحال جو بھی ہے حقیقت یہی ہے کہ اس نے خودکشی کی تھی۔" وہ اس سے اس کے بارے میں تفصیل دریافت کرنے لگی تھی۔ کچھ دیر کی بات چیت کے بعد وہ چلی گئی تھی۔ لیکن اسے حیرتوں کے سمندر میں دھکیل کر۔ اس نے اس سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟ اگر یہ مذاق تھا تو اس قدر گھٹیا۔ لیکن وہ مذاق کیوں کرتا؟ وہ جھوٹ کیوں بولتا؟ ہو سکتا ہے کہ اس نے اسے قتل کیا ہو۔ لیکن یہ بات دنیا سے چھپائی گئی ہو۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا۔ ذہن اس کی تصدیق کرنے لگا تھا۔ لیکن سوال پھر سے کلبلایا تھا ہو سکتا تھا کہ عباس سے اصل حقیقت چھپائی گئی ہو۔ لیکن پھر اسے کیوں اصلیت بتائی گئی۔ آخر وہ اس کی تھی کون؟ اگر عباس کو اصلیت پتہ بھی ہو تو اس کے ذریعہ اس کے گھر والوں کو بھی خبر ہو گی اس کی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سب حقیقت جانتے ہوئے بھی اصل بات چھپاتے ہوں۔ عجیب سی کشمکش تھی۔

♥ ♡ ♥

اس نے عباس سے کچھ کتابیں منگوانی تھیں۔ وہ اس کے کمرے میں آئی تھی۔ وہ اس وقت ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر کمرے میں آنے پر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ہاتھ میں موجود ریموٹ اس نے بیڈ پر رکھ دیا تھا۔ اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ بھی کچھ نروس ہو گئی تھی۔

"کچھ کہنا ہے آپ کو۔" عباس کو ہی پہل کرنی پڑی تھی۔ ہاتھ میں دبی لسٹ پر اس کی گرفت اور سخت ہو گئی تھی۔

"میں کچھ کتابیں منگوانا چاہتی ہوں اگر آپ لادیں تو... دراصل مجھے ضرورت ہے ان کی۔" اس نے ہاتھ میں دبی لسٹ اور روپے اس کی طرف بڑھائے تھے۔ لسٹ لے کر اس نے روپے لینے سے انکار کر دیا تھا۔

"میں لے آؤں گا۔" وہ کچھ شرمندگی اور حیرانی سے بولی تھی۔

"پلیز آپ یہ روپے رکھ لیں۔" وہ کچھ پریشان سے ہو گئی تھی۔

"میں لے آؤں گا۔" اس نے لسٹ اپنی شرٹ کی جیب میں ڈال دی تھی۔

"اگر آپ روپے نہیں لیں گے۔ تو میں کتابیں نہیں لوں گی۔" اس کی سنجیدگی سے کہی بات پر اس نے چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد روپے لینے کو ہاتھ بڑھایا تھا۔

دوسرے ہی دن وہ اس کے لیے کتابیں لے آیا تھا۔ کتابیں اس نے راشدہ کے ہاتھ بھجوائی تھیں۔ ان دنوں تو وہ چلا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ تقریباً" بیس دن بعد آیا تھا۔ اس دوران اسے یازان بالکل دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کے اپنے خیال کے مطابق وہ بیمار تھا۔ جب عباس گاؤں واپس آیا تھا وہ ان ہی دنوں دکھائی دیا۔ اس نے ان دونوں کو چھٹی کے وقت بلیک کرولا میں اپنے پاس سے گزرتے دیکھا تھا۔ گاڑی کچھ آگے جا کر پھر ریورس ہو کر اس کے قریب رکی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہی تھا۔ ساتھ ہی عباس بیٹھا تھا۔ گاڑی روکتے ہی اس نے گاڑی میں بجتا ٹیپ آف کر دیا تھا۔ شیشہ گرا کر اس نے عباس سے کچھ کہا تھا پھر اس کے جواب پر سڑک کے کنارے کھڑی زائرہ کو مخاطب کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا تھا۔ وہ شکریہ کے ساتھ اس کی آفر رد کرتی چل پڑی تھی۔ وہ ڈور کھول کر نیچے اترا تھا عقبی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ اسے مخاطب کر چکا تھا۔

"آؤ بیٹھو تم عباس کو بھی میں گھر ڈراپ کرنے جا رہا ہوں۔" کچھ سوچ کر وہ خاموشی سے آ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کیے جا رہے تھے۔ باتوں کا سلسلہ اس وقت رکا تھا۔ جب گاڑی ان کے گھر کے قریب رک گئی تھی۔ عباس کے اترتے ہی وہ بھی اترا تھا۔ اس نے عقبی سیٹ کا دروازہ کھولا تھا۔ وہ دونوں اس وقت شدید حیرت سے دوچار ہوئے تھے۔ جب وہ باہر یہ کہہ کر نکلنے سے انکار کر چکی تھی۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" گھر کے گیٹ پر ہاتھ رکھے عباس نے بڑی حیرانگی سے یازان کو دیکھا تھا۔ اس پل عباس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دکھائی دیے تھے۔ یازان اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے عباس پر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ابھی۔" وہ ابھی تک متحیر ہی تھا۔

"ہاں۔" اس نے ایک بار پھر گیٹ کی طرف نظر دوڑائی تھی۔ عباس اندر چلا گیا تھا۔ بند گیٹ پر پل بھر کو نظر ڈال کر وہ گاڑی کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھول چکا تھا پھر اشارے سے اس نے اسے آگے بیٹھنے کو کہا تھا۔ گاڑی روانہ ہو چکی تھی۔

"کیا بات ہے؟" ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمائے دوسرا بالوں میں پھیرتا وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔

"تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟" وہ ترچھی ہو کر بیٹھی تھی۔

"میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔" وہ بڑے عام و پُرسکون انداز میں گویا تھا۔

"تم نے کیوں کہا کہ تم نے قتل کیا تھا۔" وہ جرح پر اتر آئی تھی۔

"کیونکہ میں نے قتل کیا ہے۔" اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

"لوگ کچھ اور کہتے ہیں۔" سوال و جواب کا سلسلہ وہ بڑھاتی بولی تھی۔

"میں جو کہہ رہا ہوں یہی حقیقت ہے۔" وہ ایک بار پھر بڑے عام سے انداز میں کہتا گیا تھا۔

"پھر لوگ ایسا کیوں کہتے ہیں؟" اس نے اب کی بار

کچھ تیز و تند آواز میں کہا تھا۔ وجہ اس کا مسلسل انکار تھا۔

"انہیں حقیقت کا علم نہیں۔" وہ بہت آہستگی سے بولا تھا۔

"حقیقت مجھے ہی کیوں بتائی تم نے۔" اب کی بار وہ نرم لہجہ اپناتی بولی تھی۔

"تم نے پوچھا میں نے بتا دیا۔ اگر کوئی اور حقیقت جاننا چاہے تو میں وہی بتاؤں گا جو تمہیں بتایا ہے۔" اس کے ٹھہرے لہجے اور دھیمے انداز نے اسے کافی غصہ دلایا تھا۔

"اس نے جل کر خود کشی کی تھی۔ اس وقت تم عباس اور اپنے چند دوسرے دوستوں کے پاس تھے۔" اس کا لہجہ کافی حد تک ترشی اختیار کر چکا تھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ ہنوز اسی انداز میں کہہ رہا تھا۔

"قتل اور خود کشی کا فرق ہے۔" اس نے الفاظ چباتے ہوئے کہا تھا۔ لیکن اس نے اس کی بات کو رتی برابر اہمیت نہیں دی تھی اور بولا تھا۔

"اسے میں نے مجبور کیا تھا خود کشی کرنے پر۔" گاڑی بے مقصد سڑک پر رواں دواں تھی 'اسے خود بھی نہیں پتہ تھا کہ وہ کہاں تک پہنچے تھے۔ کہاں تک کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔

"کیوں؟" تڑخ کر کہا گیا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ مجھے اس سے نفرت تھی۔" اسے ان الفاظ سے نفرت تھی۔ تبھی اپنی آواز اپنے لہجے میں آنچ لیے ایک ایک لفظ پر زور دیتی بولی تھی۔

"مجھے صاف اور واضح الفاظ میں کہو کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا۔" اس کے لہجے کی سختی پر وہ ششدر رہ گیا تھا۔

"میں اپنی اوقات بھول گیا تھا۔" کچھ پل اسے خاموش رہنے کے بعد وہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہہ گیا تھا۔ اس کی بات پر وہ بھی پل بھر کو چپ کی چپ رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی کی جھلک اس نے دیکھ لی تھی 'شاید آنکھوں کی نمی چھپانے کو ہی اس نے شیشے کے پار دیکھا تھا۔ کچھ پل کی گہری خاموشی اور سکوت کے بعد وہ بڑی شکستگی بھرے انداز میں بولا تھا۔

"پھر اس لڑکی نے مجھے میری اوقات یاد دلائی۔ جب میں اپنی اوقات جان گیا تو وہ نہیں تھی۔"

"عباس کو علم ہے کہ تم نے اسے خود کشی پر مجبور کیا تھا۔" اگلا سوال یکدم داغا گیا تھا۔

"ہاں۔" اس نے کہا تو وہ بولی تھی۔

"تو پھر اس نے تمہارے ساتھ دوستی کس طرح برقرار رکھی ہے۔ اسے تمہارے ساتھ دوستی ختم کرنی چاہیے تھی۔" وہ تلخ ہو رہی تھی۔

"تم کہہ کر دیکھ لو۔ تمہاری بات مان جائے گا۔" اس نے بڑے ٹوٹے لہجے میں اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

"تم نے کیا کیا تھا اس کے ساتھ۔" اس کے لہجے میں کچھ تھا جسے محسوس کر کے وہ بے اختیار اس کی طرف دیکھ کر گاڑی روک چکا تھا۔ اس کا سوال اس کے لیے خلاف توقع تھا... جبکہ اس کا ذہن کسی اور نہج پر سوچنے لگا تھا۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچ گئی تھی۔ یقیناً" یہی بات تھی جو وہ سوچ رہی تھی۔ اب بھی اس کی نظریں سوالیہ انداز میں اس پر ٹکی تھیں۔ وہ بغیر پلکیں جھپکائے اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا مطلب تھا اس سوال کا؟" اس کی آواز دھیمی تھی۔

"جو تم سمجھ رہے ہو۔" وہ بے خوفی سے بولی تھی۔

"تمہارے خیال میں کیا کیا ہو گا میں نے اس کے ساتھ؟" اب اسے اس کے چہرے پر بڑے سخت تاثرات دکھائی دے رہے تھے۔

"یہ تمہیں خبر ہے۔" وہ ترشی سے بولی تھی۔

"نہیں خبر تم بتا دو مجھے۔" اب کی بار اس کا لہجہ بھی سخت لگا تھا اسے۔ وہ ڈیش بورڈ کو گھورے جا رہی تھی۔ جبکہ وہ لب بھینچے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ توقف بعد وہ نہایت برہمی سے بولا تھا۔

"تم ہوتی کون ہو مجھ سے یہ سب پوچھنے والی۔ اگر میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں تو صرف اور صرف عبا... " پھر

وہ قصداً" خاموش ہوا تھا' اس کی بات پر وہ یکدم سے دروازہ کھول کر نیچے اتری تھی۔ بڑے زور سے اس نے دروازہ بند کیا تھا۔ سڑک کراس کر کے وہ بیری کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ اسے روتا دیکھ کر وہ بادل ناخواستہ گاڑی سے نکل کر اس کے پاس آیا تھا۔

"دیر ہو رہی ہے۔" اس کی آواز ابھری تھی۔ جس پر اس نے کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قریب پنجوں کے بل بیٹھ کر اس سے کہنے لگا تھا۔

"اب تم جو بھی کہو گی میں اس پر بالکل غصہ نہیں کروں گا۔ تم جو چاہو کہہ دینا میں تمہیں سب کچھ بتانے کو تیار ہوں لیکن آج نہیں پھر کسی روز۔" وہ اٹھ کر بنا اسے دیکھے بات کیے گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے گاڑی میں بیٹھتا دیکھ کر ایک طمانیت بھری سانس اس کے سینے سے خارج ہوئی تھی۔ اسے گھر پر ڈراپ کرنے کے بعد وہ چلا گیا تھا۔

♥ ♡ ♥

وہ راشدہ کے ساتھ صحن میں بیٹھی گپیں ہانک رہی تھی جب اس نے اسے عباس کے ہمراہ گھر میں آتے دیکھا تھا۔ دونوں سلام کر کے سیدھے کمرے میں گئے تھے۔ رشیدہ ان کے لیے چائے تیار کرنے اٹھی تھی۔ اس نے بھی وہاں مزید ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس لیے بہانہ بنا کر اوپر آ گئی تھی۔ وہ بے قراری سے ٹہل رہی تھی بے چینی کی وجہ عباس تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ عباس کو کچھ بتائے۔ اگر وہ عباس سے کچھ کہہ دیتا تو اچھی خاصی سبکی ہوتی۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی جب اس نے اسے اوپر آتے دیکھا تھا۔ اس کی حیرت نظرانداز کر کے وہ قدم بڑھاتا اس کے پاس آیا تھا۔

"آج میں تم سے سب کہنے آیا ہوں۔ میرے خیال سے یہاں بات کرنا زیادہ بہتر ہے۔" اس کی بات پر وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ جانے کیوں ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے تھے۔ شاید بلکہ یقیناً" وہ گھبراہٹ کا شکار ہوئی تھی۔ یہ گھبراہٹ کیوں تھی کہیں عباس کی.....

ماتھے پر آئے پسینے کو اپنی ہتھیلی سے صاف کر کے وہ اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت آسمان پر کہیں کہیں بادل منڈلا رہے تھے۔ ہلکی دھیمی ہوا بھی چل رہی تھی۔ وہ لائٹ بلو رنگ کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ سلک کا دوپٹہ اپنے سر پر جما کر وہ کچھ پل بیٹھے رہنے کے بعد اٹھ گئی تھی۔ اس کے بال زیادہ لمبے نہیں تھے۔ اس کی رنگت بہت صاف اور روشن تھی۔ اس قدر گلابی رنگت اس نے بہت کم دیکھی تھی۔ اس کے سرخ ہونٹ اس کی سفید رنگت پر کھلے گلاب کی پنکھڑیوں کی سی شان رکھتے تھے۔ وہ ایک مکمل حسن کا شاہکار تھی۔ ایسا حسن اس نے بہت کم دیکھا تھا۔ اس کے حسین نرم و نازک ہاتھ پر نگاہیں ٹھہر گئی تھیں۔ پھر یکدم سے نظروں کا زاویہ بدل گیا تھا۔ وہ کچن میں گئی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرے میں جوس کے گلاس لیے آئی تھی۔ ٹیبل پر ٹرے رکھ کر وہ ایک بار پھر اس کے مقابل بیٹھ گئی تھی۔ اس نے گلاس اٹھا کر لبوں سے لگایا تھا۔

"میں وہ نہیں جو نظر آتا ہوں میں وہ ہوں جو نظر نہیں آتا۔" اس نے کہنا شروع کیا۔

اس کے دادا ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے تھے۔ بھائیوں میں ان کے ابا سب سے بڑے تھے۔ وہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ایس پی تھے۔ ان کی تین اولادیں تھیں سب سے بڑا یازان اس کے بعد سارہ اور پھر سحر۔ دوسرے بھائی کے پٹرول کے پمپ تھے۔ وہ زیادہ تعلیم حاصل نہیں کر پائے تھے۔ وہ کند ذہن تھے۔ شروع سے ہی وہ کاروبار سے دلچسپی رکھتے تھے۔ تعلیم کی طرف ان کا دھیان بالکل نہیں تھا۔ بمشکل میٹرک کر کے انہوں نے اپنے باپ سے کہہ کر کاروبار شروع کیا تھا۔ دولت قسمت سے آتی ہے۔ سب بھائیوں میں وہ ہی صاحب جائداد تھے۔ ان کی شادی ان کے

میٹرک کے فوراً" بعد ان کے چچا کی بیٹی سے کر دی گئی تھی۔ لڑکی انہیں پسند نہیں تھی۔ لیکن باپ کی طرف سے دباؤ پر وہ ناچار مان گئے تھے۔ ان کی بیوی شکل و صورت کے لحاظ سے معمولی تھیں ——————

اس لیے شروع سے ہی ان کی بیوی کے ساتھ نہیں بن سکی تھی۔ پر قسمت ان کی بیوی پر اتنی مہربان ضرور ہوئی تھی کہ وہ ماں بن گئی تھیں ان کے ہاں بیٹی نے جنم لیا تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے تین بیٹیاں مزید پیدا ہوئی تھیں۔

بڑی بیٹی کا نام شعوانہ تھا۔ دوسری زیبا' تیسری فاطمہ' چوتھی مہرین۔ وہ جو اپنی شکل صورت کی بنا پر ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنتی تھیں چار بیٹیوں کی پیدائش نے انہیں مزید کمتر کر دیا تھا۔ طنز کے نشتروں میں ایک اور نشتر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ تیسرے چچا انکم ٹیکس میں تھے۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ عثمان' علی' کنزہ' منزہ' چھوٹے چچا بھی انکم ٹیکس میں تھے۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی املہ۔ چھوٹے اور بڑے دونوں بھائیوں نے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ وہ ایک بد قسمت عورت تھی یا..... ان کی بیٹی ایک بد قسمت اولاد تھی۔ لیکن ان کی بیٹی خود کو بہت بد قسمت سمجھتی رہی تھی۔ اپنی ماں کے مقابلے میں۔

منحوس صورت' بد شکل یہ دو الفاظ ہوش سنبھالتے ہی اس کے کانوں میں پڑے تھے۔ کہنے کو تو یہ الفاظ تھے لیکن در حقیقت یہ رگ رگ کو کاٹنے والے نشتر تھے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ پہلی مرتبہ اس نے کب یہ الفاظ سنے تھے۔ یاد تھا تو اتنا کہ وہ ہمیشہ سے یہ الفاظ سنتی رہی تھی۔ جوں جوں وہ بڑی ہو رہی تھی۔ اسے شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ وہ دشمنوں کے نرغے میں پھنسی ان کے طنزیہ نشتروں اور تلخ گوئیوں کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ اسے اس کی بد صورتی کا احساس قدم قدم دلایا جا رہا تھا۔ یہ احساس صرف اس کی بد صورتی کا نہیں تھا۔ اس کی ماں بھی اس میں شامل کر لی جاتی تھی۔ اسے اپنی ماں پر حیرت ہوتی تھی۔ جسے اپنی بے عزتی کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ اس کی ماں انہیں کوئی جواب کیوں نہیں دیتی تھی۔ اسے اپنی ماں پر شدید غصہ آتا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ غصہ شدت اختیار کرنے لگا تھا۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاپن در آیا تھا۔

وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی اپنا ہوم ورک کر رہی تھی۔ پاس والے صوفے پر بیٹھی شیزہ آنٹی نے اسے کتابیں سمیٹ کر اپنے کمرے میں جانے کو کہا تھا۔

"وہاں فاطمہ وغیرہ کھیل رہی ہیں میں اتنے شور میں نہیں پڑھ سکتی۔" وہ کاپی پر جھکی کچھ لکھ رہی تھی جب شیزہ آنٹی نے اس کے گال پر تھپڑ رسید کیا تھا اس کا گال جل اٹھا تھا۔ لیکن وہ جلن دل کی جلن کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھے شخص کو دیکھنے لگی تھی۔ جو اس کا باپ تھا۔ اس نے ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ وہ یوں لاتعلقی سے ارشد انکل سے بات کرنے لگے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ جبکہ ارشد انکل نے تو نگاہ تک نہیں ڈالی تھی اس پر پہلی بار اسے اس قدر اپنی بے وقعتی کا احساس ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اس شخص سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔ جو اس کا باپ تھا۔ اسے اس عورت سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ جو اس کی ماں تھی۔ ان دونوں نے اسے بے وقعت کر دیا تھا۔ شیزہ آنٹی کو اس کی ماں اور اس سے بے انتہا نفرت تھی وہ اس کی ماں سے نوکرانیوں کی طرح کام لیتی تھیں۔ ان کے بچوں کی ذمہ داری بھی ان کی ماں کی تھی۔ ان کی خاطر انہوں نے ہمیشہ اپنے بچوں کو نظرانداز کیا تھا۔ تحفے میں ان کا بیٹا ان کے بچوں کو نفرت دیتا تھا۔

کھیل کود میں سحر گر کر زخمی ہو گئی تھی۔ شیزہ آنٹی نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ لگیں اسے پیٹنے۔ اس کی ماں بجائے انہیں روکنے اسے ہی خطاوار گردانتی رہی تھی۔ تب پہلی بار وہ پورے حلق کے بل زور سے چلائی تھی۔ اس کے چلانے پر ماں نے بھی کئی تھپڑ اس کے گالوں پر رسید کیے تھے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی تھی۔ ماں کے ساتھ ساتھ یازان بھی میدان میں کود پڑا

تھا۔
جوں جوں وہ بڑی ہو رہی تھی۔ اس کی زبان آگ اگلنے لگی تھی۔ جس نفرت کا بیج انہوں نے اس کے دل میں بویا تھا۔ اب وہ دھیرے دھیرے تناور درخت بن رہا تھا۔ اس کے مزاج میں حد سے زیادہ چڑچڑا پن پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی آگ اگلتی زبان کئی بار اس کی درگت کا باعث بنی تھی۔ گھر والوں کی سیدھی بات کا وہ الٹا جواب دینے لگی تھی۔ جواباً "اسے بھی وہ کچھ سننے کو ملتا تھا۔ جس پر بے حس سے بے حس انسان بھی لرز اٹھتا۔ اس کے میٹرک کے پیپرز تھے۔ وہ تیاری کر رہی تھی اپنے کمرے میں بیٹھی وہ کتاب پڑھ رہی تھی۔ جب یازان اندر آیا تھا۔

"تم ھو میرے جوتے پالش کر دو مجھے باہر جانا ہے۔" اس تحکم بھری آواز پر اس کا خون کھول اٹھا تھا۔

"اپنی بہن سے کہو۔" اس کے دو بدو جواب پر اس کا پارہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔ تبھی وہ غصے سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا تھا۔

"میری بہن کی شکل جوتے پالش کرنے والی نہیں ہے یہ کام تمہیں سوٹ کرتا ہے۔ اسی لیے تم کرو گی۔" اس کے منہ میں اس کی ماں کی زبان بولتی تھی۔

"میں نہیں اٹھتی۔" اس نے سختی سے انکار کیا تھا۔ وہ اس کی طرف لپکا تھا اس کے بال پکڑ کر اس نے اسے اٹھایا تھا اور یونہی لیے وہ اسے اپنے کمرے میں دھکا دے کر نیچے کارپٹ پر دھکیل چکا تھا۔

"بیٹھو یہاں یہ جوتے اس طرح چمکاؤ گی کہ اس میں تمہاری کالی شکل سفید نظر آئے۔" وہ چلانے لگی تھی۔ اس نے ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا۔ اس کے چلانے کی آواز باہر تک جا رہی تھی۔ اس کی ماں دوڑتی آئی تھی۔ اندر آ کر جو حالت دیکھی تو نہایت مشتعل ہو کر بولی تھیں۔

"ذرا بھی تمیز ہے تم میں یا سارا کچھ بیچ کر آئی ہو۔ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تم نے مجھے اس ذلیل صورت کو لے کر تم مر کیوں نہیں جاتیں۔ کیوں میری زندگی تباہ کرنے پر تلی بیٹھی ہو۔" وہ اور بھی زور سے چلانے لگی تھی۔

"کرو ان کی خدمتیں رہو ان کی نوکرانی۔ سوا[illegible] حیثیت رہے گی آپ کی دو ٹکے کی عورت بن کر یہاں زندگی۔" کچھ دیر کو رک کر وہ پھر سے چلائی تھی۔

"دو کوڑی کا کر دیا ہے آپ نے مجھے۔ اس [illegible] بھری زندگی گزارنے پر آپ نے مجھے مجبور کیا طلاق سے بچنے کے لیے غلام بنی ہیں آپ۔" آخری جملہ اس کی ماں کو گم صم کر گیا تھا۔ اس کی [illegible] سے نکلنے میں بہت وقت لگا تھا۔

"میری ایک ہی بد دعا ہے کہ کل کا دن نہ دیکھو تمہیں کل کا دن دیکھنا نصیب نہ ہو۔" وہ بے بسی روتے ہوئے بولی تھیں۔ اس کا کوئی دوست نہیں [illegible]

وہ اپنی ذات میں تنہا [illegible] رہی تھی۔ بہت اذیت ناک لمحات ہوتے ہیں۔ جب آپ اپنوں میں ہوں پر بہت اکیلے اور تنہا جی رہے ہوں۔ آپ کو تنہا جینے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ آپ کی کسی [illegible] کسی کمزوری کے باعث۔ جسے ٹھیک کرنا آپ کے بس میں نہ ہو۔ آپ ہلچل میں رہنے کے باوجود ویرانے میں کھڑے ہوں۔ وہ پر رونق گھر میں ویران زندگی گزار رہی تھی۔

چاند رات کو وہ اپنی بہنوں کے لیے چوڑیاں اور بہت سے گفٹس لایا تھا۔ وہ سب انہیں خوشی خوشی کھول کر دیکھ رہی تھیں۔ کچن میں فریج سے پیپسی کا ٹن نکال کر پیتے ہوئے وہ انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے نہیں دیکھا تھا کہ سالن میں چمچہ ہلاتی ماں کی انتہائی کرب بھری نظریں اس پر جمی تھیں۔ اس گھر میں نوکر کافی تعداد میں تھے۔ لیکن کچن کا کام کھانا تیار کرنا گھر کی عورتوں کی ذمہ داری تھی۔ ایسا برسوں سے ہوتا آیا تھا۔ کھانا گھر کی عورتیں ہی تیار کرتی تھیں۔

"امی کتنا اچھا ہوتا نا اگر ہمارا کوئی بھائی ہوتا۔ جو ہمارے لیے اس طرح کے تحفے لاتا۔" اس کی حسرت میں ڈوبی آواز پر اس کی ماں رخ موڑے خاموش آنسو بہانے لگی تھی۔ اس کی نظریں ابھی بھی لاؤنج میں

[illegible] لڑکوں پر ٹکی تھیں۔
[illegible] بھائی نہیں تو یہ طعنہ مجھے کیوں دیا جاتا [illegible] تک سمجھ نہیں پائی۔ اگر آپ کو یہ طعنہ [illegible] انہیں خوف کیوں محسوس نہیں ہوتا اگر [illegible] میں ان کا بیٹا کسی گولی کا یا کسی سانپ [illegible] یا کسی ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر مر جائے [illegible] تو کیا رہے گا ان لوگوں کے پاس۔ یہ بھی [illegible] خالی ہاتھ رہ جائیں گے پھر۔"

[illegible] مت کہو ایسا۔ گناہ ہے ایسا کہنا' اس کی ماں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے [illegible] آواز میں کہا تھا۔ وہ خلاف توقع خاموش ہو کر [illegible] رہی تھی۔ انسان بھی بڑا عجیب ہے اسے [illegible] کر خوب آتا ہے۔ پھر یہ گر استعمال کرنا [illegible] چاہتا۔ اگر وہ اس کے لیے کچھ لے آتا تو اس سے [illegible] فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن وہ لانا نہیں چاہتا [illegible] کوئی چیز لا کر وہ نفرت کے اس احساس کو مٹانا [illegible] چاہتا تھا جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتا رہتا تھا۔

اس کا باپ اس سے اتنا ہی لاتعلق تھا جتنا وہ ان سے [illegible] تھی۔ اس تعلق ولاتعلقی کے بیچ جو لکیر ان [illegible] نے کھینچ رکھی تھی وہ اس پر سے ایک انچ ہٹنے کو [illegible] تھے۔ اسے یاد نہیں آتا تھا کہ اس نے آخری بار [illegible] باپ سے تفصیلاً "بات کی تھی۔ وہ اس کی ماں کا [illegible] ایسی حیثیت دے رکھی تھی اس نے انہیں۔ [illegible] اپنا باپ کہنے پر وہ ہرگز خود کو آمادہ نہ کر پائی تھی۔ [illegible] گلدان میں پھول لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ سے [illegible] پھسل کر ٹوٹ گیا تھا۔ وہ گلدان شیزہ آنٹی نے [illegible] تھا۔ اسے ٹوٹا دیکھ کر تو وہ پھٹ پڑی تھیں۔

[illegible] اچھی نہیں پر کام تو کبھی اچھا کر لیا کرو۔ کتنا [illegible] گلدان تھا۔ اب توڑ کر چین پڑ گیا دل میں۔" وہ نان [illegible] چلا رہی تھیں۔

[illegible] سے زیادہ قیمتی نہیں تھا۔" وہ انہیں جلاتی چلی [illegible] تھی۔ جبکہ ادھر اس کی بات پر وہ آگ بگولہ ہو گئی [illegible]

اس کے میٹرک کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا۔ اس کے مارکس اچھے آئے تھے۔ وہ کالج میں ایڈمشن لینا چاہتی تھی۔ اپنی ماں کے سامنے اس نے اپنی خواہش ظاہر کی تھی۔ انہوں نے شیزہ آنٹی سے اجازت لینے کا کہا تھا کہ گھر کی بڑی وہی تھیں۔ ماں کی بات پر وہ آگ بگولہ ہوتی بولی تھی۔

"ان سے کیوں لوں اجازت۔ وہ میری ماں نہیں ہیں۔ میں اجازت آپ سے لے رہی ہوں۔ ہاں یا ناں میں جواب دیں۔" اس کی بد تمیزی عروج پر تھی۔ اس نے ہمیشہ ماں سے اسی لہجے میں بات کی تھی۔

"میں تمہیں کہہ چکی ہوں کہ شیزہ سے اجازت لو بس۔" کچھ پل ماں کو لال انگارہ آنکھوں سے دیکھتے رہنے کے بعد وہ ان کے کمرے میں آئی تھی۔ اس کے پیچھے اس کی ماں بھی دوڑتی آئی تھی غالباً" اس ڈر سے کہ وہ کچھ اول فول نہ بک دے۔ ان کا چہیتا ان کی گود میں سر رکھے لیٹا تھا۔ جبکہ وہ اس کا سر دبا رہی تھیں۔ وہ ویک اینڈ پر گھر آیا تھا۔

"مجھے کالج میں ایڈمیشن لینا ہے۔" اس نے کرختگی سے کہا تھا۔ اس کی بات پر ہکا بکا وہ کچھ پل اسے دیکھتی رہی تھیں۔ پھر بولی تھیں۔ "کالج یہاں نہیں ہے شہر میں ہے۔" ان کا لہجہ بھی تلخی لیے ہوئے تھا۔

"مجھے خبر ہے میں ہاسٹل میں رہ لوں گی۔" اس کی بات پر وہ دہک اٹھی تھیں۔

"ہمارے خاندان کی لڑکیوں نے میٹرک تک ہی پڑھا ہے۔" ان کی کرخت آواز پر بنا کان دھرے وہ کہنے لگی تھی۔

"اب میں کالج کی شروعات کر رہی ہوں خاندان کی لڑکیاں اب کالج بھی جانا شروع ہو جائیں گی۔" اس کے تلخ الفاظ پر کڑھ کر وہ مزید کہہ گئی تھیں۔

"ہاسٹل میں کیسے رہو گی؟" لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"جیسے آپ کا بیٹا رہتا ہے۔" اس فوری جواب پر وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے سلگتی آواز میں بولا تھا۔

"میں جوا کھیلوں گا تو تم بھی کھیلو گی۔"

"میں کالج کی بات کر رہی ہوں۔" اس نے تیز آواز میں کہا تھا۔ اس کی ماں نے اس کا بازو دبوچ کر اسے

کھینچنا چاہا تھا۔

"آؤٹ۔" یازان نے ہاتھ سے اشارہ کر کے اسے جانے کو کہا تھا۔

"میں کالج میں ایڈمشن لینا چاہتی ہوں میں یہی کہنے آئی ہوں۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتی بولی تھی۔

"پڑھ کر کیا کرلو گی اگر کسی اچھے رشتے کے لیے پڑھنا چاہتی ہو تو وہ تو تمہیں ملنے سے رہا۔ پی ایچ ڈی بھی کرلو تو اس صورت کے ساتھ کوئی بھی شادی پر تیار نہ ہوگا۔ رہی ہاسٹل میں رہنے کی بات ہمیں کیا پتہ کہ تم وہاں رہ کر کیا بن جاؤ۔ اب تمہیں کھلی آزادی تو دینے سے رہے۔ کیا خبر کیا گل کھلا کر آجاؤ۔"

"جو گل آپ کا بیٹا کھلا رہا ہے وہی کھلاؤں گی۔"

اس کی بات پر وہ چھلانگ لگا کر بیڈ سے اترا تھا۔ اسے چھلانگ لگاتا دیکھ کر وہ بھاگ کر نکلی تھی اپنے کمرے میں جا کر اس نے دروازہ لاک کر دیا تھا۔ وہ زور زور سے دروازہ پیٹتا رہا تھا۔ لیکن اس نے نہیں کھولا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اس کا غصہ ٹھنڈا کر دیا گیا تھا۔ وہ کچھ بھی سننے پر تیار نہ تھا اس کی ماں کے رونے اور التجاؤں پر وہ بادل ناخواستہ مان گیا تھا۔ باپ سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ انہوں نے وہی کہنا تھا جو ان کی بھابھی کہہ چکی تھیں۔ یعنی نہیں اس لیے اس نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا۔

"جو آپ میرے ساتھ کر رہی ہیں وہ آپ کی بیٹیوں کے ساتھ بھی ہوگا۔" کچھ دن بعد اس نے شیزہ آنٹی سے کہا تھا۔ جس پر انہوں نے بے تحاشا برا بھلا کہا تھا۔ آئی آر میں ماسٹرز کرنے والی اخلاقیات سے نابلد تھیں۔ اس کے چاروں طرف نفرت کی دیواریں تھیں بیچ میں کھڑی یہ اس نفرت کے نشتروں کی دن رات نشانہ بن رہی تھی۔ اس کی ماں اس کی موت کی دعائیں مانگتی تھی۔ اور وہ اپنے باپ کی موت کی جو اپنے خون سے نہیں سب کی طرح شکل و صورت سے محبت کرنے والا انسان تھا۔ جس کی نظر میں بدصورتی اتنا بڑا عیب بن گئی تھی کہ وہ بیٹی کے رشتے سے ہی لاتعلق ہو گیا تھا۔

گھر کے خرچ میں سب سے زیادہ دینے والا اس کا باپ تھا۔ لیکن اس امیر مرد کی بیوی، بیٹیوں کو شیزہ کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا۔ وہ جانتی تھی اگر اس کے ننھیال کا خوف نہ ہوتا تو وہ کب کا دوسری شادی کر کے ہمیشہ کے لیے ان کے وجود کو ہی بھول بیٹھتا۔ اس کی پھپھو اس کی ممانی تھیں۔ ذرا سی گڑبڑ ان کی بہن کی زندگی میں آگ لگانے کے لیے کافی تھی۔ وہ پھنسا ہوا تھا۔ اس کی بیوی بھی پھنسی ہوئی تھی۔ اور اب بیٹی بھی۔ حالات کے گرداب میں بظاہر پڑھے لکھے لیکن جاہل لوگوں کے بیچ جیتے جاگتے انسان اپنی بدصورتی کے باعث ذلت کی زندگی گزار رہے تھے۔ انسان انسان کو وحشی بناتا ہے۔ انسان انسان کو ذلالت پر مجبور کرتا ہے۔ اور پھر اس کے وحشی پن اور ذلالت کے تذکرے بڑی حقارت سے کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنی تخلیق پر خود کو داد نہیں دیتا کہ دیکھو کیسا وحشی بنا دیا میں نے اسے کہ انسانیت کے زمرے سے ہی نکال دیا۔ بدصورت کون ہوا؟ وہ یہ نہیں جانتا۔ اگر جان بھی لے تو جاننا نہیں چاہتا۔ وہ بھی جاننا نہیں چاہتے تھے۔

وہ ہمیشہ اپنی بیٹیوں کو کام کے لیے نہیں کہتی تھیں۔ اسے آواز دے کر اس سے کام کرنے کا مقصد اسے اس کی اوقات یاد دلانا تھا۔ وہ بڑے دھڑلے سے اپنی بیٹیوں کے لیے کہا کرتی تھیں۔

"نرم و نازک ہیں کام کرنا تو جانتی ہی نہیں۔ ارے جب ایک بندہ اپنا اسکول بیگ تیار نہ کر سکتا ہو تو وہ کام کیا خاک کرے گا۔" یہی جملے یہی الفاظ تو اسے آگ لگاتے تھے۔ وہ ہر کام کے لیے اسے ہی کہتی تھیں۔ انکار کی صورت میں اگر ان کا بیٹا گھر پر ہوتا تو اسے آواز دے کر اس کی درگت بنانے کو کہہ دیتی تھیں۔ اس کی ماں ہر وقت اپنے بیٹے کے کان بھرتی رہی تھی۔ آج اس نے یہ کہا۔ آج اس نے یہ بدتمیزی کی۔ اس کی بہنوں کو یہ کہا۔ چچی سے یہ کہا۔ اس کی دوسری دونوں چچیاں بھی اس سے اتنا ہی نفرت کرتی تھیں جتنی کہ شیزہ۔

اس کی چھوٹی بہن کو چھوٹی چچی کی بیٹی املہ نے مارا

تھا۔ جواباً" اس نے بھی املہ کی پٹائی کر دی املہ کی شکایت پر اس کی ماں نے خوب واویلا مچایا تھا۔ پھر انہوں نے اپنے شوہر کے ذریعے بات اس کے باپ تک پہنچائی تھی۔ اس کے باپ نے اسے اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ وہ اندر کمرے میں گئی تو اس نے باپ کو ٹہلتے پایا تھا۔ ایک تند نظر اس پر ڈال کر انہوں نے کہا تھا۔

"تم نے املہ کو کیوں مارا؟" ان کی سپاٹ آواز پر وہ بنا جھجکے ڈرے، بے خوف آواز میں کہہ گئی تھی۔

"اس نے مہرین کو مارا تھا۔" اس کے دوبدو جواب پر اس کے باپ نے اسے سخت نظروں سے گھورا تھا۔ وہ گلے میں دوپٹہ ڈالے، دونوں ہاتھ سینے پر باندھے نہایت لاپرواہ انداز میں پورے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

"تم آرام سے ٹک کر نہیں بیٹھ سکتیں۔ ہر وقت فساد پیدا کرنے کا شوق ہے تمہیں، صورت اچھی نہیں کم از کم ڈھنگ کے طور طریقے تو اپناؤ۔" اس کی نظریں بلا ارادہ بیڈ کے دوسرے کنارے کھڑی تھر تھر کانپتی ماں پر پڑی تھیں۔

"جو طور طریقے آپ سب نے مجھے سکھائے ہیں وہی اپناؤں گی۔ جہاں تک میری شکل کی بات ہے تو آپ نہ شادی کرتے اور نہ ہی میں پیدا ہوتی۔ قصور میرا نہیں آپ کا ہے۔" اس کی بدتمیزی، اس کے چبھتے لہجے اور انداز پر وہ سلگ اٹھے تھے۔

"دیکھو اپنی بیٹی کو کس طرح سے بات کر رہی ہے۔ گھٹیا ذلیل عورت۔ یہی تربیت ہے تمہاری۔" توپ کا رخ اب بیوی کی جانب مڑا تھا۔ وہ سر جھکا کر رونے لگی تھیں۔

"وہ کیا جواب دیں گی۔ انہوں نے ساری زندگی سوائے رونے کے اور کیا ہی کیا ہے۔ اگر ان میں کچھ ہمت ہوتی۔ تو آپ سے طلاق لے کر کب کی یہاں سے جا چکی ہوتیں۔" باپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ وہ اس قدر بدتمیز اور بے حیا ہو گی انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

"نکلو یہاں سے تم۔" انہوں نے بیوی کو باہر نکلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ شوہر کے منہ والے الفاظ پر وہ یکدم سے باہر نکلنے لگی تھیں۔ جاتے جاتے انہوں نے ایک دو بار بہت دبی آواز اپنے پیچھے آتے شوہر سے "کیا کر رہے ہیں؟" کے الفاظ کہے تھے۔ لیکن انہوں نے قطعاً نہیں دیا تھا۔ ان کے باہر نکلتے ہی اس کے باپ دروازہ لاک کر دیا تھا۔ وہ ہنوز اسی طرح کھڑی تھی۔ وہ بغاوت کے کس مرتبے پر بیٹھی تھی اندازہ اب اس شخص کو ہونے لگا تھا۔

"ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں۔" ایک زوردار اس کے منہ پر لگا تھا۔ وہ اسے جتنا مار سکتے تھے انہوں نے اسے مارا تھا۔ جو چیز ان کے ہاتھ لگی وہ انہوں اس پر دے ماری تھی۔ وہ اس قدر ڈھیٹ تھی کہ اس کی زبان سے ایک بار بھی ہلکی کراہ تک برآمد نہ ہوئی تھی۔

"یہ مت سمجھنا کہ میں تنگ آ کر جان دے دوں گی۔ تم سب کی زندگی تم سب پر اسی طرح تنگ کروں گی جس طرح تم سب نے مجھ پر زندگی تنگ کر دی ہے۔" اس کی بات پر باپ کے اشتعال میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ اسی رفتار سے لاتوں گھوسوں کی تعداد بھی بڑھی تھی۔ تھک ہار کر وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے تو ان کی بیوی اور صبا فوراً" اندر آئی تھیں۔ وہ نیچے کارپٹ پر پڑی تھی۔ اس کا ایک بازو فریکچر ہو گیا تھا۔ ان سب کو اندر آتے دیکھ کر اس نے ایک گہری نگاہ چھوٹی چچی پہ ڈال کر نہایت پرسکون انداز میں کہا تھا۔

"نشے باز کو ہی نشے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مار پیٹ سے مجھ پر کوئی فرق یا اثر نہیں پڑتا۔ مجھے قتل کر دو تو بات بنے۔"

اس کے الفاظ نے وہاں موجود ہر بندے کو منجمد کر دیا تھا۔ خوف کی ہلکی — پرچھائیں ہر ایک کے چہرے کا احاطہ کر چکی تھی۔ اسے ٹھیک ہونے میں تقریباً" بیس دن لگے تھے۔ اس دوران ہر ملنے والے سے سب سیڑھی سے گرنے کا بہانہ کرتے رہے تھے۔ یازان جب ویک اینڈ پر گھر آیا اور اسے اس پوری بات کا پتہ

... پاپا کی شان میں بڑے قصیدے پڑھے

... کی بھی کیا زندگی ہے۔" آخری الفاظ ... تاسف سے ہلاتے ہوئے ادا کیے تھے۔

♥ ♡ ♥

... انجینئرنگ کا آخری سال چل رہا تھا۔ ... بعد اس کے پیپرز ہونے والے تھے۔ وہ جی ... اسٹڈی کر رہا تھا۔ وہ اسٹڈی روم میں بیٹھا پڑھ ... وہ اس کے پاس آئی تھی۔

... پاپ تمہیں بلا رہا ہے۔" کتاب پر سے ... اس نے اسے گھورا تھا۔

... بات نہیں کر سکتیں تم۔" جواباً" وہ بھی ... واپس پلٹ کر چلی گئی تھی۔ وہ کتاب پڑھ رہی ... اس نے اسے اپنے کمرے میں آتے دیکھا

... بنا دو۔ پانچ منٹ سے زیادہ ٹائم نہ لگے۔" وہ ... تک بھی دے گیا تھا۔ وہ اس کے لیے چائے ... اسٹڈی روم میں لے گئی تھی۔ چائے کا کپ رکھ کر ... تو اس نے سیزہ کو اندر آتے دیکھا تھا۔ انہوں نے ... نظروں سے گھورا تھا۔ پھر یکدم سے نظر ... کر کے یازان کے پاس گئی تھیں۔ وہاں سے نکلتے ... اس نے آہستگی میں کہے ان کے الفاظ سنے تھے۔

"آج کل یہ کچھ زیادہ ہی خدمتیں کر رہی ہے ... تمہاری۔ ڈورے ڈالنے کے چکر میں ہے۔ کہیں بے ... نہ بن جانا۔" وہ حقیقی معنوں میں ڈرنے لگی

حالات بدلتے کیا دیر لگتی ہے وہ سوچ رہی تھی۔

"مما آپ بھی مذاق کرتی ہیں۔ بھلا میں اس سے شادی کروں گا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں خودکشی کر لوں۔" وہ استہزائیہ انداز میں مذاق اڑاتا بولا تھا۔

"دنیا بڑی عجیب ہے اس کے لوگ اس سے زیادہ ... ہیں۔ جو نہ ادھر کا رہنے دیتے ہیں نہ ادھر کا۔ کسی ... حال میں بخشتے نہیں۔ پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اگر بھلائی کرو ان کے ساتھ تو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اپنے فائدے کو بھول کر بھلائی کرنے والے کے فائدے کو تلاش کرتے ہیں۔ اگر بغاوت کر دو تو زبان اور ہاتھ سے روح اور جسم چھلنی کر دیتے ہیں۔

اپنے کمرے میں آ کر اس رات وہ بہت روتی رہی تھی۔ تقدیر نے اس پر اس کی طرف کھلنے والے سب دروازے بند کر دیے تھے۔ ایک اچھا لفظ تک اسے سننے کو نہیں مل رہا تھا۔ اگر وہ اس کے کام سے انکار کر دیتی تو بھی بری کہلاتی اور — کیا تو بھی بری بنی۔ کیا ہے یہ سب؟ کیوں اس قدر بے بسی ہے۔ وہ وہاں بیٹھی ماتم کناں تھی۔ اس کی چیخوں اس کے شکووں کو سننے والا سوائے اس کے اور کوئی نہیں تھا۔ وہ گھٹ رہی تھی۔ اندر کی گھٹن انسان کو آخر دیمک کی طرح چاٹ لیتی ہے۔ اس کے اندر کی گھٹن اس کے وجود پر حاوی ہو رہی تھی۔ وہ گھٹن اس کے ارادوں کو متزلزل کرنے لگی تھی۔ دوسروں پر زندگی تنگ کرنے کے ارادے ملیامیٹ کرنے لگی تھی۔ اس کی زندگی کے ہی پیچھے پڑ گئی تھی وہ گھٹن۔ اسے اس گھٹن سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اسے اکسانی رہتی تھی۔ لیکن وہ اس کی بات پر کان نہیں دھرتی تھی۔

وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے آپس میں بول رہے تھے۔ اس کی کسی دوست کا فون تھا وہ اٹینڈ کر کے واپس اپنے کمرے میں جا رہی تھی جب سارہ کی آواز پر بے اختیار رک گئی تھی۔

"اس کی بھی کوئی فرینڈ ہے۔ حیرت ہے وہ کیسے اس کی قینچی کی طرح چلتی زبان برداشت کرتی ہو گی۔" سارہ اس کی طرف پشت کیے بیٹھی تھی اس لیے اسے وہاں کھڑے نہیں دیکھ پائی تھی۔ تبھی آزادانہ اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھی۔ مڑی اس کی آواز پر تھی۔

"تمہیں حیرت ہو گی ہی۔ کیونکہ تمہاری تو کوئی فرینڈ ہے ہی نہیں۔ سارے بوائے فرینڈز ہیں" اس کی بات پر سارہ کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ جبکہ ماں تو جہنم میں دہک اٹھی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی

یازان اس پر چلاتا بولا تھا۔

"میری بہن پر آئندہ ایسا کوئی گھٹیا الزام لگایا تو میں ......"

"صرف تمہاری بہن ہی نہیں تم بھی۔" اس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ترشی سے کہا تھا۔

"تمہاری شرافت کے کارنامے عباس سمیت سب کو معلوم ہیں۔ اگر آپ میں سے" سب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا گیا تھا۔ "اگر آپ میں سے کوئی جاننے کا شوقین ہو تو ذرا اس کے کالج جا کر انویسٹی گیشن کر لے۔ ساری شرافت، سارا پول کھل جائے گا۔" سارہ کو ایجوکیشن میں تھی اس کے "فرینڈ" کے فون اکثر گھر آتے رہتے تھے۔ شیزہ ان الفاظ پر چلاتی بولی تھیں۔

"سمجھاؤ اپنی بیٹی کو کہ الزام تراشی بند کر دے۔ ورنہ میں اس کا گلا دبا دوں گی۔" اس کی بات پر ماں اس کی جانب لپکی تھی۔ پھر وہ اسے کمرے کی جانب کھینچنے لگی تھی۔ وہ بار بار اپنی ماں کا ہاتھ جھٹک رہی تھی۔

"تم پیدا ہی کیوں ہوئی۔ پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہیں گئیں۔" اپنے ہاتھ سے ان کا ہاتھ ہٹا کر اس نے نہایت سختی سے جھٹک کر چلاتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمیشہ ان کی طرفداری کرتی ہیں۔ میرا مذاق اڑائیں۔ کچھ بھی کہیں آپ چپ سادھے کھڑی تماشا دیکھتی رہتی ہیں۔ آپ کے لیے تو ایک تماشہ ہوں میں۔ میں نے آپ کو کہا تھا کہ مجھے پیدا کرو۔" اس نے آخری جملہ چلا کر کہا تھا۔

"ان کی بکواس سنتی رہوں۔ آپ کی طرح ذلت بھری زندگی میں نہیں برداشت کر سکتی۔ اتنی ذلت آمیز زندگی تو...... کی بھی نہیں ہوتی جیسی کہ آپ گزار رہی ہیں۔" یکایک اس کی ماں کا ہاتھ کارنر ٹیبل پر رکھے ایک وزنی گلدان پر پڑا تھا۔ یکدم سے اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا تھا۔ گلدان تو ٹوٹ ہی چکا تھا پھر اس کے سر سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ شیزہ گھبرا کر آگے بڑھی تھیں۔ جبکہ اس کی ماں اندر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ مہرین بھاگ کر نانی کے گھر گئی تھی۔ شیزہ نے آگے بڑھ کر اس کا زخم دیکھنا چاہا تھا۔ جس پر وہ چلا کر اسے پاس آنے سے منع کر چکی تھی۔ کچھ دیر میں اس کی نانی آ گئی تھیں۔ اس کے سر سے ابلتے خون کو دیکھ کر وہ باقاعدہ سینہ پیٹنے لگی تھیں۔

"کچھ اللہ کا خوف ہے تم لوگوں کو یا نہیں۔ کیسے بچی کے سر سے خون بہہ رہا ہے اور تم سب دیکھ رہے ہو۔ کہاں ہے اس کی ماں۔ سگی ہے یا سوتیلی۔" وہ مسلسل سب کو کوسے جا رہی تھیں۔ پھر وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے گئی تھیں۔ جو نزدیک ہی تھا۔ چھوٹے ماموں اسے ہاسپٹل لے کر گئے تھے۔ اس کے سر پر دس ٹانکے لگے تھے۔ اس کے اندر آگ لگا کر وہ سب اس سے ٹھنڈے نرم رویے کی آس کیوں لگا رہے تھے۔ یہ دنیا اس قدر ظالم کیوں ہے کہ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے پر عمل پیرا نہیں ہوتی۔ وہ وہی تو دے رہی تھی جو اسے دیا گیا تھا۔ اس دن کے بعد اس نے اپنے باپ کے ساتھ ساتھ اپنی ماں پر بھی فاتحہ پڑھ لی تھی۔ ایک خطرناک صورتحال اس وقت پیدا ہوئی تھی جب خود اس کی اپنی نظروں میں اس کا اپنا وجود کھٹکنے لگا تھا۔

♥ ♡ ♥

دن پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ یازان کا رزلٹ آ چکا تھا۔ تیل کی ایک فرم میں اس کی جاب بھی ہو گئی تھی۔ وہ باقاعدگی سے آفس جانے لگا تھا۔ آج کل وہ خلاف توقع بہت خاموش رہنے لگی تھی۔ وہ کسی سے بھی بات نہیں کرتی تھی۔ سارا سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتی تھی۔ رات کو اس کے دوستوں کی دعوت تھی۔ اس نے ماں کو بتا دیا تھا۔ جس پر وہ اپنی شکل پر انتہائی بیچارگی ظاہر کرتے ہوئے اسے "تفصیلاً" آگاہ کرنے لگی تھیں۔

"جاؤ اس مہارانی سے بھی کہہ دو مجال ہے جو تھوڑا سا کام کرے۔ سارا سارا دن کمرے میں لیٹی رہتی ہے۔ اب میں تنہا تو اتنا سارا نہیں کر سکتی۔ تمہاری دونوں چھوٹی چچیاں اپنے میکے گئی ہوئی ہیں۔ بلقیس بیمار ہے۔ سارہ کے پیپرز ہونے والے ہیں۔" وہ سر ہلا کر

سیدھا اس کے کمرے میں آیا تھا۔ آنکھوں پر بازو رکھے وہ بیڈ پر لیٹی تھی۔

"سنو، رات کو میرے دوستوں کی دعوت ہے۔ امی کے ساتھ ہیلپ کر لینا۔" وہ ان ماں بیٹے کی باتوں کو بھولی نہیں تھی۔ نوکرانیوں کی طرح ان سے کام لے کر وہ دونوں کس طرح تذلیل بھری باتیں کرتے اور سوچتے تھے۔

"اپنی بہنوں سے کہو۔"

"اس کے پیپرز ہیں۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

"کل نہیں ہے۔" عام سے لہجے میں جواب دیتی وہ یونہی لیٹی رہی تھی۔

"میری بہن نہیں کرے گی تم کرو گی۔" اس نے انگلی اٹھا کر اسے وارن کیا تھا۔

"میں نہیں تمہاری بہن کرے گی۔" وہ اٹھتے ہوئے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتی بولی تھی۔

"بے حیائی کے سارے ریکارڈ توڑے ہیں تم نے۔" سختی سے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے وہ تیز آواز میں بولا تھا۔

"بے حیائی کے سارے ریکارڈ تم نے توڑے ہیں شہر میں فلیٹ لے کر۔" اس کی بات پر وہ گم صم سا ہو گیا تھا۔ وہ دم بخود اسے دیکھ رہا تھا۔ اشتعال دلاتے ان الفاظ پر وہ سلگ اٹھا تھا۔

"سوچ سمجھ کر بولا کرو۔" اس کے لہجے میں نفرت کی چنگاری بھڑکتی دکھائی دی تھی۔

"سوچ سمجھ کر بول رہی ہوں تمہاری اصلیت کیا اگر میں نے سب کو بتا دیا تو کیا حیثیت رہ جائے گی تمہاری۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ تم اس "فلیٹ" پر کیا کرتے رہے ہو۔ اس راز پر سے پردہ اٹھتے ہی تمہارا سارا کردار، تمہارا وقار ملیا میٹ ہو کر رہ جائے گا۔ باپ نے تمہیں وہ فلیٹ عیاشی کے لیے خرید کر دیا تھا۔ جس کے لیے تم اسے استعمال کرتے ہو۔ بتا دوں کہ وہاں کون کون آتی رہی ہیں تم سے ملنے۔" وہ تلملایا تھا۔

"یہ جھوٹ یہ بکواس بند کر دو ورنہ میں......"

"نہ تو یہ جھوٹ ہے نہ ہی یہ بکواس ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ تمہارا ایک بہت اچھا دوست، تمہارا کلاس فیلو میری فرینڈ کا بھائی ہے۔ وہ تمہاری ایک ایک بات سے، تمہارے ایک ایک افیئر سے باخبر ہے۔ کتنی لڑکیوں سے تم عشق دعاشقی بگھار چکے ہو۔ کتنی لڑکیوں کے ساتھ فلیٹ پر......" وہ ضبط کی کڑی منزلوں سے گزر رہا تھا۔

وہ سچ کہہ رہی تھی پر یہ سچ اسے سننے میں بالکل پسند نہیں آ رہا تھا۔ اس کی بکواس اسے مسلسل اکسا رہی تھی کہ وہ اس کا گلا دبا دے۔ سچ کڑوا ہوتا ہے اس وقت اس کا حلق کڑوا ہو چکا تھا۔

"تم گھر میں میرے بارے میں بتاؤ گی میں تمہارا بتا دوں گا۔ عباس پر تم مرتی ہو۔ تم اس سے ملنے روز باغ جاتی ہو۔ کئی بار تم عباس کو گھر سے بھاگ جانے کا کہہ چکی ہو۔ لیکن وہ تیار نہیں ہوتا۔ یہ الفاظ تمہیں مزید کس بدنامی سے دوچار کریں گے اس کا رزلٹ تم جانتی ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں اڈتی حیرت پر مزید لطف لیتے ہوئے بولا تھا۔

"رہی عباس کی بات تو وہ میرا بیسٹ فرینڈ ہے میرے کہنے پر وہ ان باتوں کی تصدیق کر دے گا۔ تب کیا رہے گا تمہارے پاس۔ شکل پہلے ہی نہیں ہے۔ کردار سے بھی ہاتھ دھو لو گی۔" وہ استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے اسے گم صم کر گیا تھا۔ وہ ہکا بکا اس کی کمینگی کو سوچ رہی تھی۔ اس قدر کمینے پن پر اتر سکتا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس قدر بہتان پر وہ سکون محسوس کر سکتا تھا۔ وہ جانتی نہ تھی۔ وہ بیڈ سے اتر کر کھڑی ہوئی بہت عجیب سے لہجے میں سوال کرتی بولی تھی۔

"اس قدر جھوٹ بول کر تم زندہ رہ لو گے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ بلکہ بہت خوش رہ لوں گا۔" اس نے نہایت فخر و غرور سے جواب دیا تھا۔

"تو رہ لو۔" پھر چند ثانیے بعد وہ بہت عجیب نظروں سے اسے دیکھتی اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

پھر بنا پلکیں جھپکائے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی بولی تھی۔

"تم اتنے بے سکون رہو گے کہ تمہیں خود اپنے وجود سے نفرت ہو جائے گی۔ بے سکونی تمہاری رگ رگ میں اتر جائے گی۔ تم ایک ہی چیز کے ساتھ زندگی گزارو گے۔ بے سکونی۔ میری بد دعا ہے کہ ایسا ہو۔" پھر وہ آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ بلند کر کے بڑے جذب کے عالم میں بولی تھی۔

"اے اللہ میری سب دعاؤں کے بدلے میں میری یہ بد دعا قبول فرما۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اس کی امی اندر آ گئی تھیں۔ انہیں یوں قریب کھڑا دیکھ کر بڑی تند نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگی تھیں۔

"تم میرے بیٹے کی آس چھوڑ دو۔ میں اپنے بیٹے کے لیے تم جیسی بیوی لانے سے رہی۔ اپنی یہ آس ختم کرو۔ مر کر بھی ایسا مت سوچنا۔" وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ واپس پلٹ کر اپنے بیڈ کے پاس گئی تھی۔ بیڈ پر لیٹ کر اس نے کمبل اپنے اوپر ڈالا تھا۔ وہ دونوں کچھ پل خاموش کھڑے رہے تھے۔ پھر نکل گئے تھے۔ اسے عباس سے ملنے جانا تھا۔ اس لیے وہ گھر سے نکل گیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد وہ کچن میں آئی تھی۔ گیلن میں مٹی کا تیل تھا۔ گیلن ہاتھ میں لے کر وہ مڑی تھی۔ ملازمہ نے اسے گیلن لے جاتے دیکھ کر بڑی حیرت سے پوچھا تھا۔

"بی بی جی یہ کہاں لے کر جا رہی ہو۔" وہ بڑی پریشان سی نظر آ رہی تھی۔

"کام ہے مجھے اپنے کام سے کام رکھو۔" اپنے کمرے میں جا کر اس نے دروازہ لاک کر دیا تھا۔ ملازمہ بھاگ کر اس کی ماں کے پاس گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں سب اس کے کمرے کے باہر جمع ہو کر دروازہ پیٹ رہے تھے۔ لیکن وہ نہیں کھول رہی تھی۔ آٹھ منٹ کے اندر اندر انہیں ایک چیخ سنائی دی تھی۔

"جاؤ یازان کو دیکھو وہ باہر گیا ہے۔" ثیزہ آنٹی نے بڑی گھبرائی آواز میں ملازمہ سے کہا تھا۔ دوسری چیخ سنائی دینے پر وہ سب ادھر ادھر پریشانی کے عالم میں بھاگتے دوڑتے دروازہ کھولنے کے جتن کر رہے تھے۔ تقریباً پانچ منٹ میں وہ پہنچا تھا۔ وہ گھبرایا سا اندر آیا تھا۔ وہ دروازے کے ہینڈل کو گھماتا رہا تھا۔ اس نے ملازمہ سے ہتھوڑے کا کہا تھا۔ ملازمہ دو منٹ کے اندر ہتھوڑا لے آئی تھی۔ دروازے کے ہینڈل پر وہ شدید ضربیں لگانے لگا تھا۔ اس کا چہرہ بہت زرد اور خطرناک حد تک سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ تھک گئے تھے پھر دونوں ہاتھوں سے اس نے پورے زور سے ہینڈل پر ضرب لگائی تھی۔ دروازے کو زور زور سے دھکیلنے لگا تھا۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ دروازے کے کھلتے ہی وہ ایک طرف ہو گیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ان سب نے آگ کے شعلوں میں جلتے وجود پر نظر ڈالی تھی۔ سارہ اور سحر رو رو کر چلانے لگی تھیں۔ اس کی بہنیں کمرے کی دیوار کے ساتھ چپکی کھڑی خوفزدہ نظروں سے دیکھتی رو رہی تھیں۔ ثیزہ نے کمبل اس کے اوپر ڈال دیا تھا۔ کمرے کے باہر دیوار سے ٹیک لگائے وہ خالی خالی نظروں سے سامنے دیوار پر لگی پینٹنگ کو دیکھ رہا تھا۔

"چھوڑ دو مجھے مرنے دو مجھے۔" اس کے الفاظ سب کے ساتھ ساتھ باہر دیوار سے ٹیک لگائے اس شخص نے بھی سنے تھے۔

♥ ♡ ♥

وہ آئی سی یو میں تھی۔ اس کی حالت سیریس تھی۔ اس کی کنڈیشن ایسی ہرگز نہیں تھی کہ جس سے اس کے بچنے کا امکان ظاہر ہوتا۔

"پیش" اس کے اندر اس کے سارے وجود کو ختم کر چکی ہے۔ "اس کا بچ نکلنا بہت مشکل ہے۔" اس کی کیس فائل اسٹڈی کرنے کے بعد ڈاکٹر زمان نے انکل ارشد اور جمال سے کہا تھا۔ ڈاکٹر دوسرے مریض کو دیکھنے کے لیے چلا گیا تھا۔ لیکن انہیں غم کی وادی میں اتار کر۔ ارشد ان سے کچھ کہہ رہے تھے جو وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اس پل وہ بھول گئے تھے کہ

وہ ایک بد صورت لڑکی تھی۔ اس وقت وہ بھول گئے تھے کہ وہ ایک بد زبان لڑکی تھی۔ اس وقت وہ بھول گئے تھے کہ اس کی ماں ان کی کبھی دل پسند بیوی نہیں رہی تھی۔ اس وقت وہ بھول گئے تھے کہ کبھی وہ اس سے یا ان سے لاتعلق رہ چکے تھے۔ بس اس پل وہ رو رہے تھے۔ وہ اداس تھے۔ انہیں غم تھا۔ پچھتاوا تھا۔ کیونکہ اس پل ایک ہی احساس اندر باہر ضرب لگا رہا تھا۔ کہ وہ ان کی اولاد تھی۔ حسن و اخلاق کہیں پیچھے ہاتھ ہلاتے رہ گئے تھے۔ رشتہ غالب آ بھی گیا تو کب جب اجل نے جلدی کر دی تھی۔ یہ اداسی کیوں تھی۔ یہ اداسی اندر ضمیر کی چبھن کی تھی۔ یا اولاد کی جدائی کے خوف کی تھی۔ وہ رو رہے تھے۔ بھائی بیٹھے انہیں تسلی دے رہے تھے۔ اندر مردوں کا جانا ممنوع تھا۔ بلقیس ہی اس کے پاس ہوتی تھیں۔ اس کی چچیاں بھی باری باری آ رہی تھیں۔ دروازہ بند کر کے وہ کاریڈور میں آئی تھیں۔ وہ ان کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس کے پژمردہ چہرے ــــ بڑھی شیو، اس کے ملگجے کپڑوں پر ایک نظر ڈال کر وہ اس کے ہمراہ چل پڑی تھیں۔

"آپ پہلے کھانا کھائیں آپ کو بھوک لگی ہو گی میں....."

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس کی بات کاٹ کر وہ اس سے جمال کے بارے میں پوچھنے لگی تھیں۔

"میں نے انہیں زبردستی گھر بھیجا ہے۔ وہ آرام کریں تو بہتر ہے۔" انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ دونوں باہر لان میں آئے تھے۔ وہیں گھاس پر بیٹھ کر وہ دونوں چپ چاپ اپنی اپنی سوچ رہے تھے۔

"سنیے ڈاکٹر خورشید کس فلور پر ملیں گی۔" ایک انتیس میں سالہ عورت نے اسے مخاطب کیا تھا۔ اس کی بات پر چونک کر وہ اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔

"سیکنڈ فلور پر۔" اس نے دھیرے سے جواب دے کر نظریں پھیر لی تھیں۔

"تھینکس۔" کہتی وہ چلی گئی تھی۔ اس نے گھاس پر اپنی نگاہیں جمائی تھیں۔ جو لان میں والدین کے ساتھ آئے بچوں پر نگاہیں ٹکائے انہیں کھیلتے کودتے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔

"یازان۔ بے بسی کی زندگی بڑی اذیت ناک ہوتی ہے۔ وہ بڑی بے بسی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اچھا ہے اگر موت آ گئی اسے۔ کچھ دن جلنوں کی تڑپوں کی پھر خود ہی قرار آ جائے گا۔" وہ دھیرے دھیرے آنسو بہانے لگی تھیں۔

"ابھی مجھے کہہ رہی تھی کہ امی میرے لیے مت رونا کہ اس کے بعد میری بے عزتی کے دن شروع ہونے والے تھے۔ اچھا ہے کہ اس سے پہلے ہی۔" ..... وہ بلند آواز میں رونے لگی تھیں۔

"آج ڈاکٹر نے اس سے کہا کہ تمہاری کیا ایجوکیشن ہے۔ اس نے کہا میٹرک ڈاکٹر نے پوچھا آگے کیوں نہیں پڑھا تو۔" وہ دل کھول کر رونے لگی تھیں۔ وہ سر جھکائے ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ "اس کے بعد میری بے عزتی کے دن شروع ہونے والے تھے۔" بے اختیار اس کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔

کچھ دیر تک اچھی طرح رونے کے بعد وہ پھر سے بولی تھیں۔ "اس نے کہا کہ کوئی میرا ایڈمیشن نہیں کراتا تھا۔ کوئی میرے لیے کتابیں لانے والا نہیں تھا۔" وہ ایک بار پھر سے شدت سے روتے ہوئے سسکنے لگی تھیں۔ کچھ توقف وہ پھر سے بولی تھیں "جواباً" ڈاکٹر نے کہا تھا کہ تم ٹھیک ہو جاؤ میں تمہارا ایڈمشن کراؤں گا۔ تمہارے لیے کتابیں میں لے آؤں گا۔ کتنی بے بسی تھی نا یازان اچھا ہے نا کہ موت آئے اور لے جائے اسے۔ پل پل کی موت سے میں تو بچ جاؤں گی۔ جو اس کے الفاظ کی چبھن سے ہر وقت میرا گھیراؤ کرتی تھی۔ کب تک وہ ماں اور اپنی بد صورتی کا طعنہ سنے گی۔ کب تک وہ بھائی نہ ہونے کا طعنہ سنے گی۔ اچھا ہے نا کہ ان طعنوں سے اسے نجات مل جائے۔ ہمیشہ کے لیے۔ یہ زندگی بھی اس نے خوار کر دی اور وہ زندگی بھی۔ کیا ملے گا اسے صرف عذاب۔ یہ عذاب چنا اس نے اپنے لیے۔ اتنی بے صبری کیوں تھی وہ؟" وہ تھی کا لفظ استعمال کر رہی تھیں جس پر

پاس بیٹھے شخص کو بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ احساس کے تازیانے اب لگنے لگے تھے۔ وہ کیوں رو رہا تھا۔ اس نے تو اس کے ایڈمشن کی مخالفت کی تھی۔ اس نے تو اس کی زندگی اجیرن کردی تھی۔ جدید دور کا پڑھا لکھا بندہ کتنا جاہل تھا۔ کتنی گھٹیا سوچ کا مالک۔ اب وہ کیوں رو رہا تھا۔ کیا اسے اس بات کا خوف تھا۔ کہ اس کی تلخ گفتگو اس کی خودکشی کا باعث بنی تھی۔

اسے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوئے چھٹا دن تھا۔ اس کے سرہانے بیٹھی ماں سورہ یسین پڑھ رہی تھی۔

"امی۔" اس نے بڑی آہستگی سے پاس بیٹھی ماں کو پکارا تھا۔ اس کی آواز پر انہوں نے پارہ بند کر کے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس کی بند آنکھوں کے پیچھے چھپی تکلیف کو وہ محسوس کر رہی تھیں۔ جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

"مجھے پانی پینا ہے۔" اس نے ایک ایسی فرمائش کی تھی جسے وہ پورا نہیں کر سکتی تھیں۔

"تمہارے لیے پانی ٹھیک نہیں ہے۔" ملول و دلگیر لہجے میں کہتیں اس پل ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔

"امی میرے اندر آگ لگی ہے۔ میرا دل جل رہا ہے۔ پلیز مجھے پانی پلائیں۔" اس کی بے بسی پر دل پسیج رہا تھا۔ پر وہ بھی بے بس تھیں۔ لیکن وہ اسے مجبور کر رہی تھی۔

"امی پلیز مجھے پانی پلائیں۔ میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ امی میں ویسے بھی تو مر رہی ہوں۔ پانی سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ امی مجھے پانی پلائیں۔" وہ کراہتے ہوئے فریاد کیے جا رہی تھی۔

"امی یہ میری آخری خواہش ہے۔ میرا دل جل رہا ہے۔" وہ تکلیف کی شدت سے آنکھیں بند کیے بول رہی تھی۔ اس کی فریاد پر ماں کا دل پسیج گیا تھا۔ اتنا تو وہ بھی جانتی تھیں کہ اس کے بچنے کے چانسز نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ اس کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتی تھیں۔ کیونکہ وہ اسے تشنہ مرنے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ گلاس میں پانی ڈال کر وہ اسے سہارا دے کر پلانے لگی تھیں۔ وہ دو گلاس غٹاغٹ چڑھا گئی تھی۔ اس کی ماں رو رہی تھی۔ وہ اس سے کتنی محبت کرتی تھی۔ پر وہ کبھی جان نہیں سکی تھی۔ پانی پینے کے بعد وہ لیٹ گئی تھی۔ ماں پھر سے اس کے سرہانے بیٹھ کر پڑھنے لگی تھی۔ پڑھ کر انہوں نے دعا مانگی تھی۔

"امی۔" اس کی آواز سناٹے کو چیرتی ابھری تھی۔

"امی یازان سے کہنا کہ وہ اب عیش سے جیے کہ اس کی نظروں میں کھٹکنے والی اب نہیں رہے گی۔ اس کی ماں سے کہنا کہ اسے کبھی دلی خوشی دیکھنا نصیب نہ ہوگی۔" وہ دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔

"ایسے مت کہو۔" وہ رندھی آواز میں اسے منع کرنے لگی تھیں۔ وہ ان کی بات کو کاٹ کر پھر سے کہنے لگی تھی۔

"اپنے شوہر سے کہنا کہ ان کی بیوی کی بیٹی آخری دم تک اپنے دل سے میل صاف نہ کر پائی۔" پھر ماں کو روتا دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی تھی۔

فجر کے وقت پانچ بجے وہ سب کو عیش سے جینے کے لیے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

♥ ♡ ♥

چھوٹی چچی پچھلے ایک مہینے سے اپنی ماں کے گھر میں تھیں۔ انہیں اور ان کی بیٹی کو اس گھر میں خوف محسوس ہوتا تھا۔ اس گھر پر اداسی کے ساتھ ساتھ خوف کا بھی بسیرا تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹا سوچوں کی عمیق وادی میں کھویا ہوا تھا۔ ملازمہ اسے کھانے پر بلانے آئی تھی۔

"بھوک نہیں ہے مجھے۔" اسے جاتا دیکھ کر وہ مزید بولا تھا۔

"لائٹ آف کر دو اور دروازہ بھی بند کر دو۔" وہ سر ہلاتی اس کی ہدایت پر عمل کرتی چلی گئی تھی۔

"اس قدر جھوٹ بول کر تم زندہ رہ لو گے۔" وہ کروٹ بدل کر آنکھوں پر بازو رکھ چکا تھا۔

"یازان جس حسن پر تم نازاں ہو۔ ایک دن ایسا ...ے گا ناکہ تمہیں اس حسن کا احساس تک نہ رہے گا ...ر و غرور تو بعد کی بات۔ اکڑ و مت کو یہ اکڑ ایک دن ...را منہ چڑائے گی۔" تکیہ سینے پر رکھ کر اس نے ...وں ہاتھوں میں بھینچ لیا تھا۔ دل و دماغ میں ہلچل مچی ...ی۔

"تم کیا میری عزت کرو گے کہ میرا باپ تک میری ...زت نہیں کرتا۔ تم سے یا باقی گھر والوں سے مجھے کوئی ...ایت نہیں۔" وہ ہاتھ سے سر دبانے لگا تھا۔

"میرے دل میں کیا ہے۔ اگر میں بتا دوں تو تم سب ... قتل کرنے کے درپے ہو جاؤ گے۔ دل کی باتیں ...نے دو۔ یہ دل تو خود میرا ساتھ نہیں دیتا۔" اس کا دل ...ی اس کا ساتھ چھوڑنے لگا تھا۔ دل کی ویرانی و ...شت بڑھ گئی تھی۔ وہ بے اختیار سینے کو مسلنے لگا تھا۔

"میری ماں کا بیٹا نہیں ہے 'میرا بھائی نہیں ہے' ...لیف تمہاری ماں کو ہے اپنی ماں سے کہہ دو کہ ...سروں کی پرواہ کرنا چھوڑ دے۔ ورنہ اپنی ہمدردی کے ...اث بہت جلد یہ دنیا چھوڑ کر چلی جائے گی۔"

وہ اٹھ گیا تھا۔ اٹھ کر اس نے بستر کے دوسرے ...ارے پڑی شرٹ اٹھا کر ہائی نک کے اوپر پہن کر وہ ...تے پہننے لگا تھا۔ جوتے پہن کر وہ کمرے سے نکل کر ...کھیتوں کی طرف نکل گیا تھا۔ گھر میں اس کی ...شت بڑھ رہی تھی۔ باہر تازہ ہوا میں ٹہلتے ٹہلتے کچھ ...ل سا پڑتا محسوس ہوا تھا۔ اسے مسجد سے بہت سے ...کلتے دکھائی دیے تھے۔ وہ عشاء کی نماز پڑھ کر ...ھروں کو واپس لوٹ رہے تھے۔ کچھ سوچ کر وہ بھی ...میں داخل ہوا تھا۔ نماز پڑھ کر وہیں سجدے میں ...ر کر استغفار کرنے لگا تھا۔ کیونکہ آج اسے حقیقی ...وں میں اپنا آپ قاتل محسوس ہوا تھا۔ وہ قاتل تھا ...اس کا جو قتل اس کے ہاتھوں سرزد ہوا تھا۔ اب اس کا ...ازالہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ استغفار ہی وہ ذریعہ تھا کہ جو ...کے وجود کی بے چینی کو ختم کر سکتا تھا۔ وہ حسین تھا ...بھول گیا تھا۔ وہ ایک بااختیار باپ کا بیٹا تھا۔ وہ یہ ...بھول گیا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھا۔ وہ یہ بھول گیا تھا۔ یاد تھا تو صرف یہ کہ وہ ایک گناہ گار انسان تھا۔ کیا تھی اس کی حیثیت؟ کیا تھی اس کی اوقات؟ کیا تھا اس کا مقام؟ کہ خود اس کا وجود اس کے کردار سے مطمئن نہیں تھا۔ کس قدر قلاش انسان تھا وہ کہ خود اپنی نظروں میں اس کی حیثیت دو کوڑی کی تھی۔ یہی تھا ناں وہ وجود جس پر وہ فخر کرتا رہا تھا۔ کہاں گیا وہ فخر۔ گناہ نے اس کے اندر ہر فخر و غرور کے بت کو توڑ دیا تھا۔ اس کی حیثیت اس کا مقام مٹا کر "تم ایک گناہ گار انسان ہو" کے احساس کو اونچی مسند پر بٹھا دیا تھا۔ کتنا لاچار و بے بس تھا وہ کہ خود اپنے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا۔ اگر وہ اس قدر بااختیار تھا۔ تو گناہ کے جاگتے احساس کو مٹا دیتا۔ اگر اس میں اتنی جرات تھی تو اپنے حسن اپنے مرتبے سے وہی فخر وصول کرتا جس پر وہ ہمیشہ اکڑتا تھا۔

ایسے ہی پھیرے اس شخص کے بھی جاری تھے جو جیتے جی اس سے ہمیشہ لاتعلق رہا تھا۔ پر مرتے ہی اس کے ساتھ گہرا تعلق جوڑ گیا تھا۔ شاید وہ بھی خود کو ویسا ہی گناہ گار سمجھتا تھا جیسے اس کا بھتیجا۔ مرد عقلمند ہوتے ہیں تو اس وقت ان کی عقل کس گھاس کے میدان میں گھاس چرنے گئی تھی۔ ٹہلنے اور سوچنے سے اگر بات بنتی تو وہ ہرگز پریشان نہ ہوتے۔ وہ دونوں پریشان تھے۔ پریشانی خود کو قاتل سمجھنے سے بڑھی تھی۔ یعنی انہیں تکلیف نہیں تھی پریشانی تھی۔ نہیں تکلیف بھی تھی کہ اکثر وہ دونوں مرد تنہائی میں بیٹھے آنسو بہاتے رہتے تھے۔ عقلمند مردوں کے بے وقوفانہ افعال۔

اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے وہ کبھی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتا یا پھر ٹی وی آن کر کے کچھ دیر اس سے دل بہلاتا۔ لیکن دل اس کے اختیار سے باہر تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا تھا۔ پردے ہٹا کر اس نے گلاس ونڈو سے باہر لان کا جائزہ لیا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ لان کی لائٹ روشن تھی۔ اسے لان میں جمال چچا ٹہلتے دکھائی دیے تھے۔ وہ کچھ کچھ بھیگے ہوئے تھے۔ اس کی نظریں ان کے بے چین وجود پر مرکوز ان کے درد پر ـــــ تھیں۔ ان دونوں کا درد مشترکہ تھا۔

ایک ہی کشتی کے سوار اگر ان سواروں کو منزل کا پہلے سے پتہ ہوتا تو آج وہ کسی غلط مقام پر ہونے کے بجائے کسی اچھی راہ کے مسافر ہوتے۔ یکدم سے دل گھبرانے لگا تھا۔ پردہ گرا کر وہ واپس بیڈ کی طرف آیا تھا۔ بستر پر لیٹ کر وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

"یازان اگر میں نے تمہیں معاف کیا تو میں خود کو معاف نہیں کروں گی۔" وہ مضطرب سا اٹھا تھا۔ واش روم جا کر وضو کر کے وہ واپس کمرے میں آیا تھا۔

سورۃ الرحمان کی تلاوت کر کے وہ پھر سے سونے لگا تھا۔ نیند آگئی تھی پھر وہ اس کی قبر پر روزانہ جانے لگا تھا۔ سورۃ یسین و الرحمان کی تلاوت کر کے واپس چلا آتا تھا۔ وہ باقاعدگی سے نمازیں پڑھنے لگا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد تک وہ بیٹھا وہاں تلاوت 'استغفار پڑھتا رہتا تھا۔ جاب کب کی چھوٹ چکی تھی۔ وہ یکسوئی ہی نہیں رہی تھی کہ وہ اس جانب توجہ دے پاتا۔ ہر صبح قرآن شریف کی تلاوت سے دونوں سورتیں خواہ رحمن ہو' یسین کچھ ہی عرصے میں اسے زبانی یاد ہو گئی تھیں کہ اس کی یادداشت غضب کی تھی۔ وہ بدل گیا تھا۔ اس کی ماں پریشان و حیران ہو رہی تھی۔ جس پچی پر وہ چلا تا تھا۔ اب ان کی اطاعت کرنے لگا تھا۔ ان کی بیٹیوں کا خیال رکھنے لگا تھا۔ بیٹا ماں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ جو کھائی انہوں نے اوروں کے لیے کھودی تھی وہ اس میں خود دھڑام سے گر گئی تھیں کہ ان کا بیٹا ان کی بات کو یوں نظر انداز کرنے لگا تھا جیسے وہ انہیں جانتا تک نہیں۔ صرف اچھی بات سنتا۔ بری بات ایک سیکنڈ کے لیے بھی سننا گوارا نہیں کرتا تھا۔ "میرے بیٹے پر تعویذ گنڈے کرائے گئے ہیں۔" اس کی ماں چلا چلا کر بین کرتی رہتی تھی۔

وہ اس کے خوابوں میں آنے لگی تھی۔ وہ اسے معافیاں طلب کرتا تھا۔ لیکن وہ اسے معاف نہیں کرتی تھی۔ وہ مضطرب سا سارا سارا دن بے چین رہنے لگا تھا۔ اس لڑکی کا کہا پورا ہوا تھا۔ وہ بے سکون رہنے لگا تھا۔

♥ ♡ ♥

ہلکی ہلکی بارش کے قطرے ان پر پڑ رہے تھے۔ کے قطرے آنسوؤں سے گھل مل گئے تھے۔ اس شرٹ اس کے آنسوؤں سے تر تھی یا بارش قطروں سے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ پر بارش قطرے اس کرب کو ہرگز مٹا نہیں سکے تھے جو ا چہرے پر تاریک سایہ کیے ہوئے تھا۔ سامنے بیٹھی ا اس لڑکی کو نہیں جانتی تھی۔ وہ اس لڑکی سے کبھی ملی تھی۔ پر اس نے اس لڑکی کے لیے اپنے دل میں ا قدر شدید درد محسوس کیا تھا۔ جتنا کہ اس وقت سا بیٹھا بندہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کے غمناک الفاظ ا کا مغموم لہجہ اس کے اس انتہائی کرب کو ظاہر کر ر تھے جو اس کے اندر بسیرا کر کے اسے بے چین ر ہوئے تھا۔ وہاں بوجھل خاموشی طاری تھی۔ طو خاموشی کبھی کبھی اچھی لگتی ہے۔ پر کبھی بہت وحش ناک۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ د تھے۔ چند ثانیے بعد اس نے دونوں ہاتھ چہرے پر پھی کر بالوں میں پھنسا لیے تھے۔ وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی نہیں تھا۔ وہ جہاں تھا وہاں اب اس کے ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

"اب بھی تمہیں نہیں لگا کہ قاتل میں ہوں۔" اس کی گمبھیر آواز سکوت کو توڑ گئی تھی وہ مزید کہنے ا تھا۔

"ان ہاتھوں سے قتل نہیں کیا تو کیا ہوا۔ میرا طریقہ واردات تو کچھ اور تھا۔ الفاظ سے قتل کیا ہے میں نے اسے۔ لفظوں کا خون تھا وہ۔ جو کوئی ثبوت نہیں رکھتا۔ دنیا والوں کی نظر میں وہ خودکشی تھی۔ لیکن اصلیت یہ نہیں ہے۔ عباس یقین نہیں کرتا۔ گھر والے یقین نہیں کرتے۔ میں بارہا یہ کہتا رہا ہوں کہ اس کے خون سے میرے ہاتھ رنگے ہیں۔ لیکن کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ بجائے سہارا دینے کے میں نے اسے کھائی میں گرا کر اس کے اوپر مٹی ڈال دی۔ جو الفاظ میں اس کی مخالفت میں استعمال کرتا تھا وہ اس کی حمایت میں بھی

استعمال کر سکتا تھا۔ ایک پڑھا لکھا جاہل انسان ایسا کر سکتا تھا۔ اس قدر گھٹیا انسان تم نے اپنی زندگی میں کہیں نہیں دیکھا ہو گا۔ اور نہ ہی کبھی دیکھو گی۔" وہ رو رہا تھا۔ وہ اسے خاموش نظروں سے رو تا دیکھ رہی تھی۔ بارش کے قطروں میں تیزی آنے لگی تھی۔ وہ اسے برآمدے میں آنے کا کہہ کر خود بھی چل کر ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ بھی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا برآمدے میں آ کر ستون کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ ہوا کے ساتھ بارش تیز ہونے لگی تھی۔ بارش میں تیز چلتی ہوا انہیں بھی بھگونے لگی تھی۔ وہ بارش کو دیکھ رہا تھا۔ جبکہ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

"ایک بات کہوں۔" اس کی آواز اس کے پاس ابھری تھی۔ اسے بارش کے شور میں اس کی آواز بہت دھیمی لگی تھی۔

"ہاں کہو۔" وہ اب بھی بارش کے منظر میں کھویا اپنی سوچوں میں غرق تھا۔

"تم چلے جاؤ یہاں سے کافی دیر ہو گئی ہے۔ بارش میں تمہارا گھر جانا مشکل ہے یا تم عباس کے پاس بیٹھ کر بارش رکنے کا انتظار کر سکتے ہو۔" اس کے واضح الفاظ پر وہ مزید نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ لیکن اسے حیرت بہت ہوئی تھی۔ ایک خاموش سی نظر ڈال کر وہ اس تیز بارش میں ہی کھڑا صحن پار کر کے زینے طے کر کے نیچے چلا گیا تھا۔ اس نے عباس کی وجہ سے اسے واضح الفاظ میں جانے کو کہا تھا۔ وہ ان کے بارے میں کچھ بھی سوچ سکتا تھا۔ اور وہ ایسا سوچے وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔

♥ ♡ ♥

وہ لفافہ ہاتھ میں لیے صحن کے بیچوں بیچ کھڑی اس کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا پوسٹ کرنا ہے؟" وہ اپنے کمرے سے نکلا تھا اسے صحن میں لفافے سمیت کھڑے دیکھ کر بولا تھا۔ اس کے اثبات میں سر ہلانے پر "لاؤ میں پوسٹ کر دوں گا۔" کہتے ہوئے وہ لفافہ لے چکا تھا۔ خط اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے وہ بہت نروس ہوئی تھی۔ پرفیوم کی مہک اس کے لباس سے اٹھ کر اس کے پورے وجود میں جذب ہونے لگی تھی۔ اس کی سحر انگیز شخصیت پر چھائی سنجیدگی اس کے وقار کو مزید بڑھاتی تھی۔ وہ بہت کم گو تھا۔ بلکہ وہ دونوں بہت کم گو تھے۔ شاید یہی وجہ ان کی دوستی کی بھی ہو۔ اس کے پلٹ کر جانے پر اس نے بے ساختہ اسے آواز دی تھی۔

"عباس۔" وہ رک کر پلٹتے ہوئے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی تھی۔

"اس دن یازان مجھے اپنے بارے میں بتانے آیا تھا۔ آئی مین میں نے اس کی اداسی کی وجہ پوچھی تو۔۔۔۔۔" اس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بڑے عام سے لہجے میں کہا تھا۔

"تو۔" وہ سر جھکا کر شرمندگی سے کہہ گئی تھی۔

"شاید آپ کو برا لگا ہو۔"

"مجھے کیوں برا لگے گا وہ میرا فرینڈ ہے۔ یہاں آتا رہتا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے ہی کہا تھا۔

"وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ آپ کو برا نہ لگا ہو اس لیے میں کہہ رہی تھی۔" وہ اپنا نقطہ نظر سمجھا نہیں پا رہی تھی اسے۔ اس کے کہنے کا جو مقصد تھا وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کچھ پل وہ یونہی کھڑا کچھ سوچتا رہا تھا۔ پھر کہہ گیا تھا۔

"مجھے خود سے زیادہ اس پر بھروسہ ہے۔" یہ کہہ کر وہ رکا نہیں تھا چلا گیا تھا۔ اس کے جملے پر وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ یعنی عباس کو ان کے ملنے پر اعتراض نہیں تھا۔

عباس پیپرز دے کر فارغ تھا۔ آج کل وہ جاب ڈھونڈنے کے چکر میں تھا۔ اس کی ماں ہر وقت وظائف پڑھتی رہتی تھی کہ اسے کہیں ڈھنگ کی جاب ملے۔ اکثر وظائف میں وہ اسے بھی شامل کر لیتی تھی۔

وہ نیچے آئی تو اسے سلطانہ آنٹی صحن میں جھاڑو لگاتی نظر آئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اسے شدید کوفت

محسوس ہوئی تھی۔ "اب انٹرویو اور لیکچرز کے لیے تیار ہو جاؤ۔" وہ خود سے بولی تھی۔ اس کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ اسے خاموشی سے باہر کی جانب بڑھتا دیکھ کر وہ بڑے تعجب خیز انداز میں صبح ہی صبح اس کے باہر نکلنے کا پوچھنے لگی تھیں۔

"کچھ بوریت محسوس ہو رہی تھی اس لیے میں نے ذرا باہر تازہ ہوا میں ٹہلنے کا سوچا تھا۔" اس کا بہانہ کارگر ثابت ہوا تھا۔ وہ اثبات میں سرہلا کر صبح کی تازہ ہوا کی افادیت پر روشنی ڈالنے لگی تھیں۔ پندرہ منٹ کے طویل لیکچر پر وہ ہوں ہاں میں سرہلاتی رہی تھی۔ کلمہ شکر اس نے تب ادا کیا تھا۔ جب اس طویل صبر آزما لیکچر سے جان چھوٹی تھی۔

"جاؤ بیٹا دیر ہو رہی ہے۔"

اس کا رخ ان کے گھر کی جانب تھا۔ آج وہ اس کے گھر والوں سے ملنے اس کے گھر جا رہی تھی۔ لیکن اس کی بدقسمتی کہ اسے یہ موقع نہ مل سکا تھا۔ ان کے گھر سے کچھ قدم کے فاصلے پر وہ اسے گیٹ سے نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا رخ اس کی جانب تھا۔ اس کے قریب آنے پر وہ شدید کوفت کی شکار ہوئی تھی۔ اس کے دل میں اس کے گھر والوں کو دیکھنے کا تجسس پیدا ہوا تھا۔ وہ شعوانہ کی ماں کو دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن سارا خواب ہی چکنا چور ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اس کے قریب کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اچانک سوال پر وہ کچھ گھبرا سی گئی تھی۔ لہٰذا بہانہ گھڑ لیا تھا۔

"میں اپنی اسٹوڈنٹ کے ہاں آئی تھی۔ یہاں اس کا گھر ہے۔" اس کی بات پر اس کے چہرے پر ناگوار تاثرات ابھرے تھے۔

"میں نے منع کیا تھا نا تمہیں۔" وہ خجالت سے سر جھکا گئی تھی۔ جھوٹ بولتے وقت وہ یہ بھول گئی تھی کہ ایک بار پہلے بھی وہ اسے وہاں جانے سے منع کر چکا تھا۔ وہ چل پڑا تھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" اس کی سنجیدہ آواز پر وہ اس کی تقلید میں چل پڑی تھی۔

"تم وہاں جانے سے کیوں منع کرتے ہو۔" اس نے یونہی سرسری طور پر پوچھا تھا۔

"ان کا بیٹا کچھ ٹھیک نہیں مطلب کریکٹر کا۔" وہ خاموش رہی تھی۔

"ہمارے گھر آئی تھیں تم۔" وہ اصل بات جان گیا تھا۔ اس لیے اس نے بھی مزید جھوٹ بولنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

"ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

"پھر گئی کیوں نہیں؟" وہ سیدھی سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"تم جو چل پڑے ساتھ آنے کا کہہ کر۔"

"میری بات کیوں مانی؟" اس کا لہجہ عام تھا۔

"کیونکہ تم میری بات مانتے ہو۔" اس کا لہجہ بھی عام تھا۔

"عباس گھر پر تھا۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔" پھر کچھ توقف بعد وہ بولی تھی۔ "اس دن عباس نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔ میرا مطلب ہے یہی کہ ہمارے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں۔" اس کے تجسس کی وجہ وہ جانتا تھا۔ تبھی جواب دینا بولا تھا۔

"ہاں میں نے اصل حقیقت بتا دی تھی۔"

"کیا کہا تھا اس نے۔" اس کے لہجے میں کچھ تھا جو اسے محسوس ہو رہا تھا۔

"کچھ نہیں کہا تھا۔" وہ مسجد کے قریب پہنچ گئے تھے۔ سڑک پر سے اتر کر وہ مسجد کے نزدیک گئے تھے۔ مسجد کے دروازے کی سیڑھیوں پر وہ بیٹھ گئے تھے۔

"تم کوئی جاب کیوں نہیں کرتے۔ عباس تو جاب ڈھونڈ رہا ہے۔"

"میں وہاں کام کے بجائے غلطیاں کرتا ہوں۔ وہ مجھے دو دن بعد نکال دیں گے۔"

"غلطیاں کیوں؟" وہ متعجب سی پوچھ بیٹھی تھی۔

"کیوں کا جواب تم جانتی ہو۔" وہ مغموم لہجے میں کہتا دوسری جانب دیکھنے لگا تھا۔

"خود کو مصروف رکھو گے تو کوئی ڈیپریشن نہیں

رہے گا۔ خالی ذہن ڈیپریشن کا گھر ہوتا ہے۔" وہ اس کی بات پر کہنے لگا تھا۔

"ڈیپریشن نہیں ندامت کہو۔ ڈیپریشن نہیں ہے مجھے۔" اس کی بات پر وہ خجل سی ہو کر اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی تھی۔ اس نے اس کے الفاظ لوٹائے تھے۔

"میں نے اس وقت جو کہا تھا۔ وہ غصے میں کہا تھا۔ کیونکہ تم نے مجھے اصلیت نہیں بتائی تھی۔ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ عبث تھا۔"

"یہ ندامت سدا رہے گی کہ میں نے اسے مارا ہے۔" اس کی دلگیر و ملول آواز پر وہ کچھ پل کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے تم نے اسے نہیں مارا ہے۔ اس نے خودکشی کی تھی۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی بات پر اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔

"سب جاننے کے بعد بھی تم ایسا کہہ رہی ہو۔ عباس کی طرح تم بھی یہ تسلیم نہیں کر رہیں۔" اس نے تاسف سے گردن ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"ہم اس لیے انکار کر رہے ہیں کیونکہ تم نے اسے نہیں مارا۔ اس نے خودکشی کی ہے۔ پھر قتل والی بات کہنا غلط ہے۔" وہ اسے قائل کرنا چاہتی تھی لیکن وہ مسلسل انکاری تھا۔

"میری باتوں نے اسے خودکشی پر مجبور کیا تھا۔" وہ اپنی بات پر ڈٹا تھا۔

"بچوں جیسی باتیں مت کرو۔" وہ کچھ تیز آواز میں الجھتی ہوئی بولی تھی۔

"لیکن اسے میری باتوں نے مارا ہے۔" ایک ہی بات کی تکرار۔

"اس نے خود کو مارا ہے۔" وہ بھی اپنے موقف پر اڑی نہایت عام سے لہجے میں کہتی زمین پر پڑی جھاڑی کا تنکا اٹھا کر زمین پر لکیریں کھینچنے لگی تھی۔

"ظلم، زیادتی، جبر، بغاوت، حالات کی سنگینی کی بنا پر ہی لوگ خودکشی کرتے ہیں۔ اگر تم نے سخت الفاظ استعمال کیے تھے تو اس نے بھی کیے تھے۔ تم نے خودکشی نہیں کی۔ اگر وہ برداشت نہ کر پائی اور اس نے خودکشی کر لی تو اس میں غلطی کس کی ہوئی۔ اس کی یا تمہاری۔" کچھ پل بعد وہ مزید وضاحت کرتی بولی تھی۔ اس کی بات کے جواب میں وہ بڑے مدھم اور شکستہ انداز میں گویا ہوا تھا۔

"پر اس نے تو سب سچ کہا تھا۔ وہ سخت الفاظ نہیں تھے سچائی تھی۔ پھر وہ کیسے شریک تھی میرے ساتھ اس گناہ میں۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ میں جھوٹ کہہ رہا تھا۔" اس کی بات پر اس کی رنگت متغیر ہو گئی تھی۔ پھر اپنے تاثرات کو حتی المقدور چھپاتے ہوئے وہ پھر سے بولی تھی۔

"جو بھی ہو۔ وہ بھی اس سخت کلامی میں شریک تھی۔ تمہارے اعمال جیسے بھی رہے ہوں تمہارے اعمال کے لیے اسے جواب دہ نہیں ہونا تھا۔ اگر وہ تمہیں نرمی سے نہیں سمجھا سکتی تھی تو پھر اس کے طنزیہ نشتر کسی بھی صورت اچھائی کے زمرے میں نہیں آتے۔ اس کا مقصد تمہیں برے کام سے منع کرنا نہیں تھا۔ بلکہ تمہارے کردار کی کمزوری اور بدصورتی کو تمہارے سامنے تمام تر نفرت کے ساتھ ظاہر کرنا تھا۔ میں اس کے خلاف نہیں بول رہی۔" آخری جملہ وضاحت کے انداز میں اپنی صفائی میں کہا گیا تھا۔

"میں اس کی غلطیوں کی نشاندہی کر رہی ہوں۔ کسی کو سدھارنے کے لیے ٹھیکیدار بننا آسان ہوتا ہے۔ لیکن خود کو سدھارنا بہت مشکل، میں مانتی ہوں کہ اس کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی۔ میں مانتی ہوں کہ اس پر جینا تنگ کر دیا گیا تھا۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ تم نے انتہائی جہالت کا ثبوت دیا تھا۔ تمہارا ہر فعل غلط تھا۔ پر غلطیاں اس سے بھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی بدزبانی کے بجائے اچھا اخلاق اپنا کر سب کے دلوں کو جیت سکتی تھی۔ خاموشی سے حالات بدلنے کا انتظار کر سکتی تھی۔ باپ کے ساتھ مقابلے پر کھڑی ہونے کے بجائے وہ اپنی خدمت سے اپنے اور ان کے بیچ کھڑی دیوار کو گرا کر محبت کے پھول کھلا سکتی تھی۔ پر اس نے خود اپنے لیے سوچا، اس کی ماں پر کیا بیت رہی ہے۔ اسے اس

سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ایک اپنے مفاد کے لیے تو وہ بھی جیتی رہی تھی۔ بچاؤ کے اور بھی بہت سے راستے تھے۔ اس راستے پر جانا جسے حرام قرار دیا گیا ہو۔ کسی بھی طرح سے اس کے لیے بچاؤ کی راہ نہ تھی۔ اس کے اقدام کو تم قتل قرار دے رہے ہو۔ اس کے غلط اقدام پر قتل کا لیبل لگا کر تم کس عذاب کے کس گناہ کے مرتکب ہو رہے ہو۔ یہ تم جانتے نہیں، حالات سے فرار کے لیے اگر یہ راہ بہتر ہوتی تو مذہب اسے کبھی حرام قرار نہ دیتا۔ مت سوچو ایسا۔" وہ ان الفاظ پر زور دیتی بولی تھی۔

"تم نے جو کہا تھا۔ وہ برا تھا۔ لیکن برا اس نے بھی کہا تھا۔ تمہیں اپنے الفاظ پر شرمندگی ہے۔ تمہیں اپنے ہر برے فعل پر شرمندگی و ندامت ہے۔ گناہ کا احساس ہی تمہارے سب گناہوں کو مٹانے کے لیے کافی ہے۔ استغفار سے گناہ تلف ہو جاتے ہیں۔ چاہے وہ سمندر برابر ہوں۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تمہیں اپنے گناہ کا احساس ہے۔ ورنہ بہت سے ایسے ہیں جو خود اپنے ہاتھوں دس دس قتل کر کے چین کی نیند سوتے ہیں۔ کیونکہ ان پر سے اللہ نے اپنی رحمت کا سایہ اٹھا لیا ہوتا ہے تم پر اس رب کا کرم ہے۔ جو تمہیں اپنے گناہ کا احساس ہوا ہے۔ سب کو تکلیف مت دو۔ اپنے گھر والوں کو تکلیف دے رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہے تم پر اپنے باپ کا کتنا پیسہ خرچ ہوا ہے۔ تمہاری تعلیم یوں ہی رائیگاں جائے گی۔ تم اپنے ذہن کو استعمال نہیں کرتے تو یہ بد دیانتی ہے، ناشکرا پن ہے۔ قیامت کے دن تم سے سوال ہو گا کہ اس رب نے تمہیں جس علم سے نوازا تھا تم نے اس سے کام کیوں نہ لیا۔ شکر ادا کرو اس رب کا۔ جس نے تمہیں تعلیم سے بہرہ مند کیا۔ جس نے تمہیں باعزت عہدہ دیا اور تم نے اسے ٹھکرا دیا۔ یہ سب۔ جو تم کر رہے ہو وہ قطعاً" ٹھیک نہیں ہے۔ یہ مزید گناہ پر گناہ ہے۔ مت کرو ایسا۔ مت سوچو صرف اپنے لیے۔" وہ اٹھ گئی تھی۔

"میں کل آؤں گی یہاں۔" وہ بھی اٹھ گیا تھا۔

"میں اسی وقت تمہارا انتظار کروں گا۔" اس کی بات پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ جاتے جاتے اس نے نوٹ کیا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

♥ ♡ ♥

عباس کو ایک گارمنٹ فیکٹری میں جاب مل گئی تھی۔ وہ اکثر یازان سے ملنے لگی تھی۔ اس کی باتیں اس پر کئی سوچوں کے در وا کر گئی تھیں۔

وہ اسے اپنے باغ میں لے کر گیا تھا۔ جہاں سیب، امرود، لیموں کے درخت تھے۔ یہ باغ وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک ریسٹ ہاؤس بنایا گیا تھا۔ جو صرف ذاتی استعمال کے لیے تھا۔ اکثر ان کے دوست احباب عزیز و رشتے دار یہاں گھومنے پھرنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ اس کے دوست بھی کئی بار یہاں آئے تھے۔ وہ آج کافی عرصہ بعد یہاں آیا تھا۔ اس نے اس کے لیے کئی عدد سیب توڑے تھے۔ جو بہت اعلیٰ قسم کے تھے۔ وہ اسے ریسٹ ہاؤس دکھانے لگا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے ہر کمرے میں سہولت کی ہر چیز موجود تھی۔ ٹیلی فون، سی ڈی پلیئر، ٹیلی ویژن، اے سی، کارپٹ، سنگل بیڈز ہر چیز موجود تھی۔ ریسٹ ہاؤس کی دیکھ بھال کے لیے ایک الگ ملازم رکھا گیا تھا۔ وہ دونوں باہر نکلے تھے۔ ملازم سیب اور امرود توڑ کر بڑی بڑی ٹوکریوں میں رکھتے جا رہے تھے۔ اس وقت وہاں اسے تقریباً" دس ملازمین دکھائی دیے تھے۔ انہیں قریب آتا دیکھ کر ان سب نے انہیں سلام کیا تھا۔ ان کے سلام کا جواب دیتے وہ آگے بڑھے تھے۔

"یہ باغ اس کے باپ کا تھا۔" چلتے چلتے اس نے اس کی دھیمی آواز سنی تھی۔

"وہ اکثر یہاں آیا کرتی تھی جس پر کئی بار میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا تھا کہ وہ آئندہ مجھے یہاں دکھائی نہ دے۔ باغ اس کے باپ کا تھا۔ پر اس پر ملکیت میری تھی۔ اس باغ کی مالک ہوتے ہوئے بھی وہ مالک نہیں تھی۔ اپنی مرضی سے وہ یہاں بیٹھ تک

نہیں سکتی تھی۔ کتنی بے بسی تھی نا۔ کتنا بڑا دکھ تھا۔" وہ چلتے چلتے رک گیا تھا۔ وہ دونوں کافی آگے نکل آئے تھے۔ بیر کے درخت سے ٹیک لگا کر وہ اپنا پاؤں درخت کے تنے پر جما کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اپنی آنکھیں بند کر گیا تھا۔

"ہم نے اس پر جینا تنگ کر دیا تھا۔ اب ہم کہتے ہیں کہ وہ ایک باغی لڑکی تھی۔ کہ اس نے خودکشی کیوں کی۔ دھول جھونک رہے ہیں ہم اپنی آنکھوں میں دلاسا دے رہے ہیں خود کو یہ کہہ کر کہ اس نے خودکشی کی ہے۔" وہ بہت تھکے لہجے میں بولا تھا۔

"استغفار طلب کرنے کے باوجود بھی انسان اسی طرح گناہ گار ٹھہرایا گیا ہوتا تو استغفار کی تلقین مذہب کیوں کرتا۔ تمہارے گناہ کے خاتمے کے لیے استغفار اور یہ احساس کافی ہے یہ جو کچھ تم کرتے رہتے تھے وہ بہت غلط تھا اور اب تم نے وہ تمام برے کام چھوڑ دیے خود کو سدھارا۔۔۔۔۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ بہت مضطرب سا بولا تھا۔

"لیکن یہ احساس میرے دل کو مطمئن نہیں کر پا رہا۔"

"خود کو سمجھاؤ گے تو یہ تمہیں مطمئن کر دے گا۔"

"عباس بھی یہی کہتا ہے۔" کچھ دیر بعد اس نے اسے کہتے سنا تھا۔

"اور کیا کہتا ہے وہ؟" اس نے بظاہر عام سے لہجے میں پوچھا تھا۔ لیکن اسے اس کا لہجہ عام نہیں لگا تھا۔

"یہی جو تم کہتی ہو۔" وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔ پھر ایک قدم پیچھے ہٹ کر گردن گھما کر اس نے ایک ملازم کو اپنے قریب آتے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو مگ تھے۔ قریب آ کر اس نے چائے کے مگ ان کے ہاتھوں میں پکڑائے تھے۔

"شکریہ۔" اس نے نرم و ملائم آواز میں کہا تھا۔ ملازم کے جاتے ہی وہ ایک بار پھر نظریں اس پر مرکوز کر گئی تھی۔ وہ اسے گھاس پر بیٹھتا دیکھ کر خود بھی کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی تھی۔

"تم ہمیشہ لائٹ کلرز پہنتی ہو۔ تمہیں ڈارک کلرز اچھے نہیں لگتے؟" اس کا سوال اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ کچھ متعجب سی وہ کچھ توقف بعد بولی تھی۔

"مجھے لائٹ کلرز اچھے لگتے ہیں۔"

"ہاں مجھے اندازہ ہے۔ کل تم نے لائٹ پنک سوٹ پہنا تھا۔ اور آج لائٹ پرپل۔" وہ اس کے کپڑوں کا ناقدانہ جائزہ لیتا ہوا بولا تھا۔ وہ تعجب خیز نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ وہ اس کے کل کے کپڑوں کے بارے میں کیسے جان گیا تھا جبکہ وہ اس سے ملی ہی نہیں تھی۔ وہ اسکول بھی نہیں آئی تھی کہ جس سے وہ یہ اندازہ لگاتی کہ شاید راہ چلتے اس کی نظر پڑی ہو کیونکہ کل سنڈے تھا۔ تو پھر کیسے جان گیا تھا وہ کہ اس نے پنک کلر کے کپڑے پہنے تھے۔

"تم کیسے جانتے ہو کہ میں نے پنک کلر کے کپڑے پہنے تھے۔" وہ کچھ چونک گیا تھا۔ پھر خشک جھاڑی کا ایک تنکا اٹھا کر اس نے ہوا میں اچھالتے ہوئے کہا تھا۔

"عباس بتا رہا تھا۔" اس کی بات پر پل بھر کو حیران ہوئی دوسرے ہی پل اسے اس کے چہرے پر دھنک

شگفتہ محمود کی مرتب کردہ
"خاتون کا دستر خوان" اور "کرن دستر خوان"
کے بعد
خوبصورت رنگین تصاویر کے ساتھ پہلی بار چینی
کھانوں کی مکمل کتاب
چائنیز کھانے
قیمت/150 روپے
ڈاک خرچ/16 روپے
منگوانے کا پتا
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار کراچی

بکھرتی نظر آئی تھی۔ تب وہ بھی دھیرے سے مسکرایا تھا۔

♥ ♡ ♥

گاؤں میں شادی تھی۔ اسے بھی انوائٹ کیا گیا تھا۔ جلدی جلدی تیار ہو کر وہ راشدہ رشیدہ کے پاس نیچے آئی تھی۔ سیڑھیوں سے اتر کر وہ رک سی گئی تھی۔ وہ دونوں صحن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور اسے آتا دیکھ کر وہ دونوں خاموش ہو گئے تھے۔ اس نے ریڈ اینڈ بلیک کمبنیشن کا ڈریس زیب تن کیا تھا۔ سلک کا دوپٹہ اس کے شانوں پر تھا۔ اس کے کھلے بال ہوا کے سنگ لہرا رہے تھے۔ عباس نے یکدم سے نظریں نیچے جھکائی تھیں۔ جبکہ وہ پہلے ہی اپنے جوتوں پر نگاہیں ٹکائے ہوئے تھا۔ انہیں سلام کر کے وہ اندر راشدہ کے پاس گئی تھی۔ وہ دونوں تیار ہو رہی تھیں۔ وہ پلنگ پر بیٹھی انہیں تیار ہوتا دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کی نظریں صحن میں کرسیوں پر براجمان ان دونوں پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ اس نے عباس کو اٹھ کر اندر جاتے دیکھا تھا۔ جبکہ وہ رشیدہ کو بلا کر اس سے کچھ کہنے لگا تھا۔ کچھ دیر میں رشیدہ اس کے پاس آئی تھی۔

"یازان آپ کو بلا رہا ہے۔" حیرت سے سوچ میں پڑتی وہ اٹھ کر باہر آئی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ اٹھ گیا تھا۔ اس کی سوالیہ نگاہیں خود پر اٹھتی دیکھ کر وہ بولا تھا۔

"تم شادی میں نہیں جاؤ۔"

"کیوں۔" وہ الجھ گئی تھی۔

"بس کہا نا تم نہیں جاؤ۔" اس کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔ چند پل اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ بنا کچھ کہے اوپر چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ عباس کے کمرے میں گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ان کے گھر سے واپس لوٹا تھا۔ راشدہ اور رشیدہ بار بار اس کے اچانک ارادہ بدلنے کی وجہ پوچھتی رہی تھیں جس پر اس نے سر درد کا بہانہ بنا کر بات ادھر ادھر کر دی تھی۔

کچھ دن بعد وہ اسے لانگ ڈرائیو پر لے گیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اس قدر سنجیدہ تھا یا اس کے ساتھ ہونے والے حادثے نے اسے سنجیدہ کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اس وقت وہ بلیک جینز، بلیک شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے گلاسز بھی لگائے ہوئے تھے۔ وہ اس کے گلاسز کو غور سے دیکھتی رہی تھی پھر ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کے گلاسز اتار لیے تھے۔ وہ تعجب خیز انداز میں اسے دیکھنے لگا تھا۔

"میرے ساتھ بیٹھ کر تم گلاسز مت لگایا کرو۔ میں ہماری ہونے والی ہر ملاقات میں تمہاری آنکھوں کی اداسی کم ہونے کے اندازے لگاتی ہوں۔ گلاسز سے میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتی۔" اس نے گلاسز ڈیش بورڈ پر رکھ دیے تھے۔

"میری آنکھوں کی اداسی میں کچھ فرق نہیں آیا؟" اس نے سرسری طور پر پوچھا تھا۔

"آ رہا ہے۔" اس نے سرہلاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ پھیکی ہنسی ہنسنے لگا تھا۔ اس کی مذاق اڑاتی ہنسی دیکھ کر وہ باہر دیکھنے لگی تھی۔

"تمہاری بہنیں پڑھتی ہیں یا نہیں۔ آئی مین کالج میں؟" کچھ توقف بعد وہ پھر سے اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

"بڑی کالج میں ہے سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ چھوٹی میٹرک میں ہے۔" وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔

"تمہاری باقی کزنز، مطلب شعوانہ کی بہنیں وغیرہ۔" وہ اصل سوال کی طرف آئی تھی۔

"پڑھ رہی ہیں۔ اس کی بہن بھی سیکنڈ ایئر میں ہے۔" وہ خاموش ہوا تھا۔ کچھ پل خاموش رہنے کے بعد وہ کہنے لگا تھا۔

"اس سے میں نے کہہ رکھا ہے کہ وہ جتنا پڑھنا چاہتی ہے یا کسی بھی فیلڈ میں جانا چاہتی ہے اس پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔ وہ بہت ذہین ہے اس کا رجحان میڈیکل کی طرف ہے۔ میں اسے سپورٹ کروں گا۔ حالانکہ میری ماں ایسا ہرگز نہیں چاہتیں۔ وہ ڈرتی ہیں کہ میں چچی اور ان کی بیٹی کے جال میں پھنس جاؤں گا بلکہ پھنس چکا ہوں۔ میں کیا چاہتا ہوں وہ کبھی جان ہی

نہ پائیں گی۔ ان کا بیٹا دن رات کس عذاب سے گزر رہا ہے۔ جانتے بوجھتے بھی وہ انجان بن رہی ہیں۔ "میرے بیٹے پر کسی نے کچھ عمل کر دیا ہے۔" یہ جملہ سارا سارا دن ادا کیا جاتا ہے۔ نہیں سمجھتیں وہ مجھے۔ نہ ہی سمجھنا چاہتی ہیں وہ مجھے اپنی بیٹیوں کے لیے کچھ اور سوچتی ہیں اور ان کے لیے کچھ اور۔" اس کی آنکھوں میں وہی اداسی دکھائی دی تھی جو اول روز اس نے دیکھی تھی۔

"عباس اس بار ویک اینڈ پر گھر نہیں آیا۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ وہ کیوں نہیں آیا، دراصل آنٹی اس کو بہت یاد کر رہی تھیں۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" اس کی بات کے جواب میں اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

وہ اس کے گلاسز اٹھا کر اس کا جائزہ لینے لگی تھی۔

"کسی دن میں تمہارے ہاتھ کے دال چاول کھانے آؤں گا۔ تم بہت مزے کا بناتی ہو۔" دوسری سڑک پر نظریں جماتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"یہاں ایک دوسرا گاؤں ہے۔ قریب ہی ہے دیکھو گی؟" وہ بولا۔ وہ کچھ سن نہیں پائی تھی۔ اسے غائب دماغ دیکھ کر وہ گاڑی اسی راستے پر ڈال گیا تھا۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ میں بہت اچھے دال چاول بناتی ہوں؟" دھیمے لہجے میں پوچھے گئے سوال پر وہ بے اختیار اس کی جانب دیکھنے لگا تھا۔ کچھ تامل بعد بولا تھا۔

"عباس بتا رہا تھا۔" کچھ توقف بعد مزید بولا تھا۔

"وہ بہت تعریف کرتا ہے تمہارے کھانوں کی۔" وہ مسکرائی تھی۔

"صرف کھانوں کی ہی تعریف کرتا ہے۔" گلاسز ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تمہاری بھی کرتا ہے۔" اس کی سنجیدہ بات پر وہ کہنے لگی تھی۔

"جو لوگ خود اچھے ہوتے ہیں وہ دوسروں کو بھی اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ عباس خود....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"دیہات کی حدود یہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ یہ دیہات بہت بڑی آبادی پر مشتمل ہے۔ یہاں گیس کا کنواں ہے ایک بیرونی کمپنی اسے لیڈ کر رہی ہے۔" اس نے گاڑی سڑک کے کنارے روکتے ہوئے کہا تھا۔ پھر وہ دونوں گاڑی سے اترے تھے۔ اسی دن اس نے اسے دوسرے دیہات کی سیر بھی کرا دی تھی۔

♥ ♡ ♥

وہ گیٹ سے باہر نکلا تھا۔ عباس اس قدر طوفانی بارش میں کیوں آیا تھا وہ بڑی حیرت میں تھا۔ عباس سارا کا سارا بھیگا ہوا تھا۔ وہ خود بھی باہر آتے آتے بھیگ چکا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس کے چہرے پر بکھری پریشانی نے اسے بھی پریشان کر دیا تھا۔

"زائرہ گھومنے پھرنے کے لیے باہر گئی تھی۔ ابھی تک واپس نہیں آئی۔ میں تم سے مل کر جب گھر گیا تو گھر والوں نے یہی بتایا مجھے۔ میرے خیال سے وہ جھیل گئی ہو گی۔ اس قدر طوفانی بارش میں وہ وہیں گھری رہ گئی ہے۔ رات کا وقت ہے کچھ ہو انہ ہو اسے۔" وہ بہت الجھا ہوا اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ دیکھ کر "میں ٹارچ لاتا ہوں" کہہ کر چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹارچ لے کر آیا تھا۔

"پیدل ہی جانا پڑے گا اس قدر طوفانی بارش میں تو گاڑی نہیں لے جا سکتے۔" وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھانے لگے تھے۔

"تم نے گھر میں بتایا ہے کہ میرے ساتھ جا رہے ہو۔" عباس نے تیز تیز قدم اٹھاتے بغیر اسے دیکھتے کہا تھا۔

"ہاں۔" اس نے مختصر کہا تھا۔

"آخر ضرورت ہی کیا تھی اسے تنہا گھر سے نکلنے کی۔" عباس برہمی سے بولا تھا۔

"حوصلہ کرو یار کچھ نہیں ہو گا۔" اس نے اسے تسلی دی تھی لیکن اس کی تسلی نے کچھ خاص فرق نہیں ڈالا تھا۔ چالیس منٹ کا راستہ انہوں نے پچاس

منٹ میں طے کیا تھا۔ ایسی طوفانی بارش اور رات کے اس گھپ اندھیرے میں اس کی تنہا واپسی کا امکان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس وقت مکمل اندھیرا تھا۔ اس قدر تاریکی میں وہ سمتوں کی پہچان بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔

"بے وقوفی کی بھی حد ہوتی ہے۔" عباس ایک بار پھر برہمی سے بولا تھا۔

"ریلیکس یار سب ٹھیک ہو گا۔" کیچڑ کی وجہ سے ان کے جوتے بھاری ہو گئے تھے۔ ایک جگہ رک کر انہوں نے ایک بڑے پتھر سے اپنے جوتے رگڑے تھے تاکہ کیچڑ اتر جائے۔ اب چلنے میں کچھ آسانی تھی۔ اگرچہ کچھ دیر بعد اسی صورت حال کا سامنا کرنا تھا۔ رات کے اس پہر جھیل پر صرف بارش کا شور حاوی تھا۔ جانوروں کی آوازیں اس شور میں دب گئی تھیں یا پھر وہ بھی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ کئی مینڈک ان کے جوتوں تلے آ کر کچل گئے تھے۔ جس پر یازان کو بہت افسوس ہوا تھا۔ جھیل کے گرد چکر لگا کر وہ ریسٹ ہاؤس کے نزدیک آئے تھے۔ نزدیک چونکہ کوئی آبادی نہیں تھی اس لیے انہوں نے قیاس ہی لگایا تھا کہ وہ ہیں ریسٹ ہاؤس کے آس پاس ہو گی۔ وہ دونوں برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ گئے تھے۔ دونوں ہاتھوں میں ٹارچ لیے اردگرد روشنی میں اس کو تلاش کر رہے تھے۔

"زائرہ۔" اس نے تیز آواز میں پکارا تھا۔

عباس پھر سے برآمدے کے باہر ٹارچ گھمانے لگا تھا۔

"زائرہ۔" اس نے ایک بار پھر آواز دی تھی۔ لگاتار دو تین بار نام لے کر اس نے مزید پکارا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ مسلسل ایک ایک جگہ پر ٹارچ کی روشنی ڈال کر چیک کر رہا تھا۔ اس کی آواز پر وہ جو مدہوش تھی۔ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ کوئی اسے پکار رہا تھا۔ مزید کئی بار پکارنے پر اس نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔

"میں یہاں ہوں۔" اس نے پورے زور سے چلاتے ہوئے کہا تھا۔ لیکن اس کی آواز بمشکل اسے خود سنائی دی تھی۔ ٹارچ کی روشنی اسے دکھائی دے رہی تھی۔ اس لیے وہ نڈھال قدموں سے اٹھ کر بھاگتی ہوئی اس کے پاس گئی تھی۔ اس نے کسی کو خود سے ٹکراتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ اس کی وجود کی گرمی سے اس کا ٹھنڈا وجود چنگاری بن گیا تھا۔

"مجھے یہاں بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ حیرت کا مجسمہ بنا ہوش و خرد سے بیگانہ تھا۔ ہاتھ میں دبے ٹارچ کی روشنی کچھ کچھ ان دونوں پر پڑ رہی تھی۔ پاس کھڑے عباس کی نظریں جب ان دونوں پر پڑیں تو یکدم سے اس نے یازان کے ہاتھ میں دبے ٹارچ کو کھینچ کر آف کر دیا تھا۔ اور پلٹ کر دوسری جانب رخ موڑ چکا تھا۔ وہ اسے خود سے الگ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی اس لیے اس سے الگ نہیں ہو رہی تھی۔

"ٹارچ آن کرو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس کی آواز بہت پست تھی بمشکل ان دونوں کو سنائی دے رہی تھی۔ دونوں ٹارچ عباس کے ہاتھوں میں تھیں جو کہ آف تھیں۔

"یازان ٹارچ آن کرو۔ میں مر جاؤں گی۔" وہ شدت سے روتے ہوئے کہنے لگی تھی۔

"یازان ٹارچ آن کرو۔" اب کے وہ اس کی شرٹ جھنجھوڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میرے پاس نہیں ہے ٹارچ۔" اس نے دھیرے سے کہا تھا۔

"تو کس کے پاس ہے؟" وہ چلائی تھی لیکن یہ چیخ بمشکل سنائی دی تھی۔

"عباس کے پاس۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔

"عباس ٹارچ آن کرو۔ تم لوگ ٹارچ آن کیوں نہیں کرتے۔" کوئی رد عمل نہ پا کر وہ پورے زور سے چلاتے ہوئے بولی تھی۔

"مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ میرا دم گھٹتا ہے۔ میں مر جاؤں گی۔ میں میرا دم..." اس کی شرٹ اس کے گرم آنسوؤں سے اب بھیگ رہی تھی۔ عباس نے قدم بڑھا کر اس کے ہاتھ میں ٹارچ پکڑا دی تھی۔ اور کچھ دور جا کر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے کچھ پل بعد بہت خاموشی سے ٹارچ آن کر دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ بدستور روتی رہی تھی۔ اس نے اسے خود سے الگ کر کے کہا تھا۔

"بارش رکے گی تو جائیں گے فی الحال یہیں بیٹھو۔" اس کی حالت بڑی ابتر دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی رنگت زردی مائل تھی۔ اس کے ہونٹ بالکل نیلے اور اس کی آنکھیں بہت سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر بکھرے بالوں کو اپنے ہاتھ سے سمیٹ کر وہ جونہی مڑنے لگا تھا۔ وہ چکرا کر گرنے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ فرش پر گر پڑتی۔ اس نے فوراً اسے سنبھالا تھا۔

"عباس یہ تو بے ہوش ہو گئی ہے۔" وہ چلایا تھا۔ اس کی بات پر وہ فوراً اٹھ کر ان کے قریب آیا تھا۔

"دور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ فی الحال تو کچھ نہیں ہو سکتا۔" اس نے بہت سنجیدہ لہجے میں جواب دیا تھا۔ اندھیرے کے باوجود وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس وقت اس کے چہرے پر کسی حد تک سنجیدگی اور رنجیدگی احاطہ کیے ہوئی تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے اسے بازوؤں میں اٹھایا تھا اور برآمدے کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھا دیا تھا۔ خود بھی اس کے نزدیک بیٹھ گیا تھا۔

"اب صرف انتظار ہی کریں گے صبح کا۔" اس کی بات آواز پر عباس بھی ان سے کچھ فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ بارش جاری تھی۔ آسمانی بجلی کی کڑک مزید خوف کو بڑھا دیتی تھی۔ خوف اس وقت حالات کی نزاکت کا تھا۔ وہ دونوں اپنے خیالوں میں محو کچھ سوچ رہے تھے۔

"عباس ٹارچ بند کر دو۔ بیٹری ڈاؤن ہو جائے گی ویسے بھی وہ اس وقت بے ہوش ہے۔ اگر ہوش میں آئی اور ٹارچ کی بیٹری اس وقت تک ڈاؤن ہو چکی ہو تو شاید پھر سے چلانے لگے۔" اس کی بات پر وہ اثبات میں سر ہلاتا اپنی ٹارچ بند کر چکا تھا۔ لیکن وہ بے ہوش ہی رہی تھی۔ کب اس کی آنکھ لگی تھی اسے خبر نہ تھی۔ آنکھ عباس کے جھنجھوڑنے پر کھلی تھی۔

"بارش رک چکی ہے۔ صبح ہونے والی ہے۔" وہ مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھتا کچھ پل تو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ وہ اس وقت کہاں تھا۔ لیکن آنکھیں پوری طرح کھول کر جب اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی تو تب سب یاد آیا تھا۔ اس وقت ہلکی ہلکی صبح کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی۔ اس کی نگاہ بے اختیار پاس بیٹھی زائرہ پر پڑی تھی۔ پھر نظریں فوری طور پر ہٹا کر اس نے عباس سے کہا تھا۔ "تم یہاں بیٹھو میں گھر جا کر گاڑی لاتا ہوں۔ موبائل بھی نہیں ہے ورنہ تو کال کر کے منگوا لیتے۔" وہ اٹھ گیا تھا۔

"تم بیٹھو یہاں میں جا کر لاتا ہوں۔"

وہ تعجب خیز نگاہوں سے اسے دیکھتا ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ کچھ پل سوچتا رہا تھا۔

"تم کیوں نہیں رہ جاتے یہاں؟"

"اگر وہ بیدار ہوئی اور اس نے مجھے اکیلے اپنے ساتھ بیٹھے دیکھا تو شاید کچھ... رہنے دو میں ہی چلا جاتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ کچھ غلط سوچے میرے بارے میں۔" اس کی بے تکی بات وہ ہضم نہیں کر پایا تھا۔

"اکیلا تو میں بھی رہوں گا پھر کیا میرے بارے میں وہ ایسا نہیں سوچے گی۔ جو بقول تمہارے، تمہارے یہاں ٹھہرنے پر سوچے گی۔ کم آن عباس بے وقوفوں جیسی باتیں مت کرو۔ وہ ایسی باتیں سوچنے والی نہیں ہے۔" اس نے بات واضح کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہاری بات اور ہے۔ وہ تمہارے ساتھ بے تکلف ہے۔ وہ تم پر اعتماد کرتی ہے۔ تم سے جھجکتی نہیں ہے۔ لیکن میرے ساتھ اس کا رویہ کچھ اور ہے۔ مجھے اپنے پاس دیکھ کر وہ گھبرا جائے گی۔ جبکہ تمہیں دیکھ کر اسے ایسا کچھ بھی خیال نہیں ہو گا۔" اس کی بات سے اتفاق نہ کرنے کے باوجود وہ کہہ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے تم چلے جاؤ۔ مما سے کہنا گاڑی کی چابی اسٹڈی روم میں میں نے اسٹڈی ٹیبل کے دراز میں رکھی تھی۔ وہیں پڑی ہو گی۔" وہ کچھ دیر تک وہیں کھڑا

اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر وہ سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آیا تھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ واپس سیڑھیوں کی جانب آیا تھا۔ وہیں بیٹھ کر اپنے جوتے اتار کر صاف کرنے لگا تھا۔ جوتے صاف کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر اس کے پاس آیا تھا۔ بہت زیادہ بارش نے ٹھنڈ پیدا کر دی تھی۔ اس کے نیلے ہونٹوں کو دیکھ کر اس نے اس کی سردی کو محسوس کیا تھا۔ اس کی جیکٹ جواب تقریباً" سوکھ چکی تھی اس نے اتار کر اس کے اوپر ڈال دی تھی۔ وہ اٹھنے ہی لگا تھا جب اس نے اس کا ہاتھ تھام کر مدہوش لہجے میں ماں کو پکارا تھا۔ اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے چھوڑ دیا تھا۔ تقریباً" ساٹھ منٹ میں عباس واپس آیا تھا۔ اس نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر پچھلی سیٹ پر ڈالا تھا اور خود آگے بیٹھ گیا تھا۔ ڈرائیونگ عباس کر رہا تھا۔ اگلے دس منٹ میں گاڑی ان کے گھر کے باہر رک گئی تھی۔

♥ ♡ ♥

اس کے اسکول درخواست عباس دے چکا تھا۔ اس دن کے بعد وہ اس سے ملنے نہیں آیا تھا عباس سے وہ اس کی خیریت و بیماری کے متعلق پوچھتا رہا تھا۔

زیادہ چلّانے کے باعث اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ گھر لے جانے کے بعد عباس نے گاؤں میں موجود ڈاکٹر عالم کو بلایا تھا۔ اس نے میڈیسن لکھ دی تھیں جو عباس لے آیا تھا۔ اب اس کی طبیعت کچھ کچھ بہتر ہو رہی تھی۔ اس کی بیماری کے دوران اس کے گھر والوں نے اس کی اچھی خاصی تیمارداری کی تھی۔ آج اس کی طبیعت کافی حد تک اچھی تھی۔ بستر پر پڑے پڑے تنگ آ کر وہ اٹھ گئی تھی۔ اس نے اپنے لیے چائے بنائی تھی۔ چائے پی کر وہ کچھ دیر صحن میں ٹہلتی رہی تھی۔ مقصد طبیعت پر چھائی بوریت کو دور کرنا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے میں گئی۔ الماری کھول کر اس نے کپڑے نکال لیے۔ اسٹڈی ٹیبل پر سے بیگ اٹھا کر اس نے کپڑے ترتیب سے اس میں رکھ دیے تھے۔ اس کا ارادہ صبح گھر جانے کا تھا۔ بیڈ پر سے بیگ اٹھا کر وہ جونہی پلٹی تھی۔ اسے دروازے کے پاس کھڑا یازان دکھائی دیا تھا۔ وہ اسے اندر آنے کو کہہ گئی تھی۔ اس کے اندر آنے پر وہ مزید بولی تھی۔

"تم بیٹھو میں......"

"نہیں مجھے جانا ہے۔ میں تمہاری طبیعت کا پوچھنے آیا تھا۔" وہ بیگ ہاتھ میں تھامے کچھ پل اسے دیکھتی رہی تھی پھر اس کے پاس سے گزرتے ہوئے بیگ لیے اسٹڈی ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی تھی۔

"جاؤ۔" اس تضحیک بھرے لفظ پر اگر وہ مزید ایک سیکنڈ بھی کھڑا رہتا تو اس کے لیے وہ خود کو کبھی معاف نہ کرتا۔ وہ بڑی سرعت سے مڑ کر وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر در آنے والے غصے کی لہر اس نے بھی دیکھ لی تھی۔ لیکن اس نے اسے ذرا بھی اہمیت نہیں دی تھی۔

اگلے دن اس نے اسے نالے کے کنارے بیٹھے دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ گردن موڑے بالکل لاتعلق بن گیا تھا۔ اسے اسکول سے دیر ہو رہی تھی اس لیے بنا رکے چلی گئی تھی۔ چند دنوں تک ایسا ہوتا رہا تھا۔ ایک دن وہ مزید نظرانداز نہیں کر سکی تھی اس کے اس طرز عمل کو اسے اپنے قریب آتے دیکھ کر وہ اٹھ کر روانہ ہوا تھا۔ وہ اسے آوازیں دیتی رہی تھی جس کو وہ نہیں سن رہا تھا۔

"یازان بات سنو میری۔" وہ چلائی تھی۔ لیکن وہ کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھا کر بھاگتی ہوئی اس کے سامنے آئی تھی۔ اس کی آستین کھینچ کر اسے روک چکی تھی۔

"تم رکے کیوں نہیں؟" وہ کچھ نہیں بولا تھا۔

"مجھے اسکول سے دیر ہو رہی ہے اس لیے تم مجھے واضح طور پر بتا دو کہ تم کیوں ناراض ہو مجھ سے۔" اس کی معصومیت پر وہ تلملا گیا۔ اس دن دوسری بار جانے کا کہہ کر اس نے اس کی انسلٹ کی تھی۔ اب اس قدر توہین پر وہ معصوم بنی اس سے وجہ دریافت کر رہی تھی۔

"واضح جواب یہ ہے کہ آئندہ میں تم سے ملنے ہرگز نہیں آؤں گا۔ میں اگر وہاں آیا تھا تو صرف عباس کی وجہ سے ورنہ......" جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ بالکل سمجھ نہ پائی تھی۔

"عباس کی وجہ سے؟" کچھ پل کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

"ہاں عباس کی وجہ سے۔" وہ ترشی سے بولا تھا۔ کچھ پل اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ چل پڑا تھا۔

"کیا مطلب ہوا وضاحت کرو۔" وہ بھی اس کے برابر میں چلتے ہوئے بولی تھی۔ لیکن وہ جواب نہیں دے رہا تھا۔

"تم سے کہہ رہی ہوں وضاحت کرو۔" تقریباً" چلاتے ہوئے وہ اس کی راہ روکے کھڑی ہوئی تھی۔

"عباس کی وجہ سے میں تمہارا احترام کرتا ہوں۔ اس کی خاطر میں تمہاری عیادت کو تم سے ملنے آیا تھا کیونکہ وہ میرا فرینڈ ہے۔ اس لیے اس کی محبت کی عزت مجھ پر فرض ہے۔ اس لیے میں تمہاری......" اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ ایک زوردار تھپڑ اس کے گال کو سرخ کر چکا تھا۔

"ہوش و حواس میں نہیں تھے تم۔ اب تمہیں ہوش آ چکا ہو گا۔" اس کے سخت برہم لہجے کو نظرانداز کر کے وہ ایک بار پھر چل پڑا تھا۔

"کیا سمجھ کر تم یہ بکواس کرتے رہے۔" اس نے دوبارہ اس کی شرٹ کھینچ کر اسے روکا تھا۔

"بولو کیا سمجھ کر تم نے یہ بکواس کی۔" وہ دھیرے سے [illegible] کر بولا تھا۔

"مجھے نہیں اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔"

"بھاڑ میں گیا اسکول میں نہیں جا رہی۔" وہ رو پڑی [illegible]

"اگر کوئی دیکھ لے تو کیا سوچے گا۔" وہ سچ مچ [illegible] کہا تھا۔

"عباس کو بلاؤ۔" اس نے آنسو صاف کرتے [illegible] کی آواز میں کہا تھا۔ اس کی بات پر وہ مزید [illegible] ہوا تھا۔

"کیوں؟"

"میں کہہ رہی ہوں عباس کو بلاؤ۔" وہ چلائی تھی۔

"ٹھیک ہے میں بلا دوں گا۔ لیکن فی الحال تم اسکول......" وہ شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ اس نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔ وہ بہت برہم تھی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"آج شام چھ بجے تم میرے گھر آ رہے ہو میں وہیں تم سے بات کروں گی۔"

"میں نہیں آؤں گا۔" اسے اپنی تذلیل بھولی نہیں تھی۔

"تو میں بھی خود کو شوٹ کر دوں گی۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس نے اسے دھمکی دی تھی۔ یہ دھماکہ اس بندے کو توڑ پھوڑ گیا تھا۔

♥ ♡ ♥

شام چھ بجے وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں رک گئی تھیں یا اسے رکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ وہ صحن میں پلاسٹک چیئر پر بیٹھی سیڑھیوں کی جانب دیکھ رہی تھی۔ آج پہلی بار اسے انتظار کے صبر آزما لمحات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ انتظار اس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے وہ آج جان پائی تھی۔ پونے سات بج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں گئی تھی۔ بستر پر لیٹ کر وہ سوچوں میں مگن ہو گئی تھی۔ وہ نہیں آیا تھا۔ اسے اس پر شدید غصہ آنے لگا تھا۔ بے قراری پورے وجود کو لپیٹ میں لینے لگی تو وہ اٹھ کر جوتے پہن کر باہر آئی تھی۔ کچن میں جا کر ایک گلاس ٹھنڈا پانی پینے کے بعد وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی تھی۔ وہ بہت تیز تیز سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ ابھی کچھ سیڑھیاں باقی تھیں جب وہ اسے اوپر آتا دکھائی دیا تھا۔ وہ اوپر آ رہا تھا۔ اسے اس قدر عجلت بھرے انداز میں اترتے دیکھ کر وہ رک گیا تھا۔ وہ بھی رک گئی تھی۔ اس کے ہر انداز سے غصے کے آثار واضح نظر آ رہے تھے۔ بنا کچھ کہے وہ تیزی سے اوپر چلی گئی تھی۔ اس کی تقلید میں وہ بھی اوپر آیا تھا۔

وہ صحن میں کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی نگاہیں سامنے گملے میں منی پلانٹ پر جمی تھیں۔ وہ بھی چپ چاپ سا دوسری کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"مجھے دیر ہو گئی دراصل......"

"کم ٹو دی پوائنٹ۔" اس نے اس کی بات کاٹی تھی۔ ایک خاموش نگاہ اس کے برہم چہرے پر ڈال کر وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر گیا تھا۔

"بات کہو۔" اس نے کہا تھا۔

"بات تم نے کرنی ہے۔ کیونکہ بلایا تم نے تھا۔" وہ آنکھیں کھول کر اسے اس کی بات یاد دلانے لگا تھا۔

"تم عباس کی وجہ سے مجھ سے ملنے آئے تھے؟" وہ یکدم سوال پر آئی تھی۔

"ہاں۔"

"کیوں؟" وہ سخت لہجے میں بولی تھی۔

"اس لیے کہ وہ میرا دوست ہے اس کی......" اس کا خون کھولنے لگا تھا۔

"اس وضاحت پر تم صبح میرا ردعمل دیکھ چکے ہو۔ وہ کہو جس پر مجھے وہ سب نہ کرنا پڑے۔" وہ اس سے بھی زیادہ سخت لہجے میں بولی تھی۔ وہ عجیب الجھن میں پھنسا تھا۔ اب کیا کہے وہ۔ جو حقیقت تھی وہ سن نہیں رہی تھی۔ اب وہ ایسا کیا کہہ دیتا کہ جس پر اسے تھپڑ نہ کھانا پڑتا۔ وہ کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا۔ لیکن جب بات کھل ہی چکی تھی تو مزید وضاحت میں کوئی قباحت نہیں تھی۔

"عباس تم سے محبت کرتا ہے۔ اس حوالے سے تم میرے لیے قابل احترام تھیں اور ہو۔ اس لیے میں تمہاری عزت کرتا ہوں کیونکہ تم میرے دوست کی محبت ہو۔ اپنے دوست کی خاطر ہی میں تمہاری عیادت کے لیے آیا تھا۔ لیکن تم نے میری انسلٹ کر دی تھی۔ میں نے آج تک تمہارے ساتھ ایسی کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی تھی۔ کہ جس پر تم اس قدر انسلٹ کرتیں میری۔ اس لیے مجھے یہ اچھا نہیں لگا تھا۔" اس کی بات کے اختتام پر وہ قدرے سپاٹ سی آواز میں کہہ گئی تھی۔

"تمہیں کس نے کہا کہ عباس مجھ سے محبت کرتا ہے۔" اس کی آواز بہت سرد تھی۔

"مجھے پتہ ہے۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ عباس مجھ سے محبت کرتا ہے۔" اس نے اب کی بار الفاظ پر خاصا زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

"عباس نے۔" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا تھا۔ اس کی وجہ اس کا لہجہ تھا۔ جس سے وہ کچھ نروس ہوا تھا۔

"کب کہا؟" ایک بار پھر اس کی سرد آواز ابھری تھی۔

"جب پہلی بار اس نے تمہیں دیکھا تھا تب۔" اب کی بار بھی اس کا لہجہ دھیما تھا۔

"تم نے اس سے ایسا کچھ نہیں کہا تم نے تو اس سے بھی پہلے مجھے دیکھا تھا۔" اس کے طنز پر وہ گم صم ہو گیا تھا۔ اسے اس لڑکی پر بڑی حیرت ہو رہی تھی وجہ اس کا نہ سمجھ میں آنے والا رویہ تھا۔

"اس نے تم سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔" وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی۔

"ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا تھا۔ پھر بولا تھا۔

"تم تو یوں کہہ رہی ہو۔ جیسے تم اس سے انجان ہو۔ تم بھی محبت کرتی ہو اس سے پھر اس وقت اس سوال جواب کا مقصد کیا ہے۔" وہ برداشت نہ کر پایا تھا اس کا عجیب و غریب رویہ تبھی وہ بات صاف کر گیا تھا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے کہا؟" وہ سرد سی آواز میں بولتی اس کے چودہ طبق روشن کر رہی تھی۔

"مجھے پتہ ہے کہ تم......"

"میں نے کہا میں یہ پوچھ رہی ہوں۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے اس نے بہت زور سے ٹیبل پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔

"نہیں، لیکن مجھے پتہ ہے کہ تم اس سے محبت......" وہ ایک بار پھر اس کی بات کاٹتی بڑی برہمی سے بولی تھی۔

"یاد کرواؤ ایسی کوئی ملاقات جس میں میں نے تم سے کہا ہو کہ میں عباس کی محبت میں پاگل ہو رہی ہوں یا مر رہی ہوں یاد کرو۔" وہ یکدم سے بولا تھا۔

"ہاں تم نے ایسا نہیں کہا۔" وہ کر ختگی سے بولی تھی۔

"پھر تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟"

"کیونکہ میں نے عباس کے لیے تمہارے احساسات محسوس کیے ہیں۔ اس کے نام کے ساتھ تمہارے چہرے پر جو دھنک رنگ نظر آتے تھے۔ اس نے مجھے بتایا ہے۔ تم جو اس کے بارے میں کرید کرید کر مجھ سے پوچھتی تھیں اس نے مجھے بتایا ہے۔ اس کے ذکر پر تمہارے چہرے پر جو خوشی کے عکس تمتما اٹھتے تھے اس نے مجھے بتایا ہے۔ کیا بچہ ہوں میں کہ سمجھ نہ پاؤں۔ اب تم انجان بننے کی کوشش مت کرو۔ اگر بالفرض تم انجان بن رہی ہو تو یہ اب جان لو کہ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ تم اس کا عشق ہو۔ تمہیں اس سے محبت کرنی ہے تم اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔ تمہارے ساتھ ہونے والی ہر ملاقات میں اس نے ہمیشہ مجھ سے تمہاری ہی بات کی ہے۔ وہ ہر وقت تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہے بولتا رہتا ہے۔ تم کس کلر کے کپڑے پہنتی ہو۔ تم کیا اچھا بناتی ہو ہر وقت وہ تمہاری تعریفیں اس لیے کرتا تھا۔ کیونکہ وہ تم سے بے تحاشا محبت کرتا ہے۔ تمہارے لباس تک کو وہ مجھ سے ڈسکس کرتا رہا ہے۔ تمہارے نام کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر کیا رنگ اترتے تھے یہ صرف میں جانتا ہوں۔ تمہارے نام کے ساتھ اس کے لبوں پر کس قدر حسین مسکراہٹ در آتی ہے یہ صرف میں نے دیکھا ہے۔ وہ تم سے محبت ہی نہیں کرتا عشق کرتا ہے۔ جہاں تک تمہاری بات ہے تو تمہاری محبت کو میں نے جس طرح محسوس کیا تمہیں بتا دیا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس سے محبت کرتی ہو پر چھپا رہی ہو اور تم ایسا کیوں کر رہی ہو اس کی وجہ میں جان نہیں پایا ہوں۔" وہ دم سادھے سب سن رہی تھی۔ جو کچھ وہ کہہ گیا تھا وہ اس کے حواس سلب کر گیا تھا۔ وہ جھٹکوں کے زد میں تھی۔ اس انکشاف نے اس کے دل و دماغ میں ایک ہلچل مچا دی تھی۔

"وہ تمہارے پل پل کی خبر رکھتا ہے۔ میرے اور تمہارے بیچ جتنی بھی ملاقاتیں ہوئی ہیں وہ اس کے ایک ایک لفظ سے آگاہ ہے۔ ہم دونوں کے بیچ صرف تمہارے متعلق ہی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ کیونکہ اسے تمہارے متعلق باتیں سننا اچھا لگتا تھا۔ افتخار کی شادی میں میں نے تمہیں اس کے کہنے پر جانے سے منع کیا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تم وہاں جاؤ۔ اس کی فیملی کے افراد شادی بیاہ میں بہت چھچھورے پن پر اتر آتے ہیں اس لیے میں جھیل پر تمہارے پاس اگر آیا تھا تو صرف اس کے کہنے پر۔ اب کہو یہ محبت نہیں تو کیا ہے۔ تم نہیں کرتیں۔ اب جیسا تم مکر گئی ہو تو میں کیا کہہ سکتا ہوں پر اتنا بتا دوں کہ وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے۔ اس لیے اب یہ ناٹک بند کر دو۔" وہ بھی کھول اٹھا تھا۔ اس لیے اس کی زبان پر جو آیا بول دیا تھا۔ جو دھماکے اس کے ارد گرد ہوئے تھے وہ اس کے وجود کو نیست و نابود کر چکے تھے۔ کھنڈر بنی وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ غصے سے اس کا چہرہ جل اٹھا تھا۔ وہ اس کے معصوم بن جانے پر تپ اٹھا تھا، اس لیے اس کے چودہ طبق روشن کر گیا تھا۔ اس نے اسے اٹھتے دیکھا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے پاس آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ چند پل اسے دیکھتی رہی تھی اسے نظرانداز کر کے وہ اپنی رسٹ واچ کو کھولنے اور بند کرنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی حرکت اس وقت تھمی تھی۔ جب اس کے قریب آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔

"اس کے ساتھ بیٹھ کر میرے بارے میں جو کچھ تم بولتے رہے ہو۔ تم نے مجھ سے اس کی تصدیق کی تھی یا خود سے ہی فرض کر کے آگے اس کی ترویج کی۔ کب کہا میں نے تم سے کہ میں عباس سے محبت کرتی ہوں۔ کب اس نے مجھ سے اظہار کیا تھا کہ تم دونوں نے یہ فرض کر لیا کہ میں اس کی ہوں۔ کب اس کے

ساتھ بیٹھ کر میں نے ایسا کچھ کہا کہ جس پر تم دونوں کو یقین آگیا ہو کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ میں اگر اس کے بارے میں تم سے بولتی رہی ہوں تو اس کی وجہ صرف تم سے بات کرنا تھی۔ تم سے بات بڑھانی تھی، کیونکہ وہ تمہارا دوست تھا تم اس کے متعلق بات کرتے ہوئے بوریت محسوس نہ کرتے۔ تم کہتے تھے کہ عباس تمہاری تعریف کرتا ہے۔ تو میں یہ سوچ کر خوش ہوتی تھی کہ تم اس سے میرے بارے میں کرید کرید کر پوچھتے ہو۔ میرے چہرے پر بکھرے رنگ اس لیے اس وقت کھلتے نظر آتے تھے کیونکہ مجھے یہ یقین تھا کہ تم میرے پل پل کی خبر رکھتے ہو۔ افتخار کی شادی میں میں صرف تمہاری خاطر نہیں گئی تھی کیونکہ میں تمہاری بات رد نہیں کر سکتی تھی۔ حالانکہ مجھے تب غصہ آیا تھا۔ تمہیں گھر سے نکل جانے کو میں نے پہلی بار اس لیے کہا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ عباس ہمارے بارے میں کچھ غلط سوچے۔ تمہیں دوسری بار جانے کو میں نے اس لیے کہا تھا کیونکہ مجھے تم پر شدید غصہ آیا تھا۔ جھیل سے مجھے لے آنے کے بعد تم غائب ہو گئے تھے۔ اور پھر میری بیماری پر پوچھنے ٹھیک آٹھویں دن تم آئے تھے۔ جب میں نے تمہیں بیٹھنے کو کہا تو تم چلنے کی بات کرنے لگے۔ مجھے بے تحاشا غصہ آیا اور میں نے تمہیں جانے کو کہہ دیا تھا۔ تمہارے پیچھے پڑے رہنے کا مقصد ہمدردی نہیں محبت تھی۔ عباس کیا محسوس کرتا ہے کیا کہتا ہے، مجھے نہیں معلوم پر تمہارے بیہودہ الفاظ نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے۔ تم عباس سے میرے متعلق بولتے رہے۔ تمہاری غلط فہمی نے اسے خوش فہمی میں مبتلا کر دیا کہ میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں۔ جو کچھ تم نے مجھ سے کہا وہ تم نے عباس کو بھی بتایا ہو گا۔ میرے چہرے کے دھنک رنگ اور جو جو فضول بکواس تم نے کی وہ سب۔ اسے میری محبت میں تم نے مبتلا کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میرے متعلق اس سے یہ بکواس کرتے رہے ہو مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میری تعظیم میرا احترام صرف عباس کی وجہ سے کر رہے ہو۔ ورنہ میں یہ احترام تمہارے منہ پر دے مارتی۔" وہ اس کے قدموں میں بیٹھی رو رہی تھی۔ جبکہ وہ حیرت کی تصویر بنا اس کے بہتے آنسوؤں کو دیکھ رہا تھا۔

"میں عباس کو نہیں جانتی میں صرف یازان کو جانتی ہوں۔" وہ روتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

"یازان تمہیں نہیں جانتا وہ صرف عباس کو جانتا ہے۔" کچھ پل بعد اس کی دھیمی آواز سکوت کو توڑ گئی تھی۔ اس کی بات پر اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"ایسے مت بولو تم..... تم جھوٹ بول رہے ہو۔ بہانے بنا رہے ہو۔" وہ بھیگی آواز میں تیز لہجے میں کہہ گئی تھی۔

"نہ میں جھوٹ بول رہا ہوں نہ ہی بہانے بنا رہا ہوں۔ تم عباس کی ہو۔ کیونکہ وہ تم سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ یازان کے بارے میں اگر تم آج تک تم سوچتی رہی ہو تو اب سوچنا چھوڑ دو۔ اب صرف عباس کو سوچو۔ کیونکہ یازان عباس کے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ نہیں کر سکتا۔ اس کی پل پل کی بے قراری کا گواہ ہوں میں۔ تمہیں حاصل کرنا اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ ایسا میں نہیں کروں گا۔" اس نے دو ٹوک انداز اختیار کرتے ہوئے اسے صاف جواب دے دیا تھا۔ وہ اٹھ کر جانے لگا تھا جب وہ بھی اٹھ کر کہنے لگی تھی۔

"تم عباس کے لیے میری قربانی دے رہے ہو۔ میں بھیڑ بکری نہیں ہوں کہ جسے تم قربان کر دو۔" وہ اس کے سامنے کھڑی روتی ہوئی بولی تھی۔

"میری راہ میں مت آؤ۔ میں اپنے دوست کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا۔" آخری تین الفاظ پر وہ چلایا تھا۔

"تم میری راہ میں آئے تھے۔" وہ پھر سے رونے لگی تھی۔

"اب نہیں آؤں گا۔" وہ چٹانی لہجے میں کہہ کر جانے لگا تھا۔

"تو مرنے دیا ہوتا مجھے جھیل کے کنارے۔ وہاں

سے کیوں لائے تھے تم۔" وہ بھی جواباً چلائی تھی۔

"میں نہیں عباس لایا تھا۔" اب کی بار وہ نرم لہجہ اختیار کر گیا تھا۔

"نفرت ہے مجھے اس سے۔" اس کے آنسوؤں پر وہ پگھلنے لگا تھا۔

"عباس بہت شریف انسان ہے۔ وہ بہت اچھا ہے تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گی۔ میرے ساتھ رہ کر تمہیں کیا ملے گا۔ میرے جیسے گناہ گار اور برے انسان کے ساتھ رہ کر تمہیں آخر کیا ملے گا۔ میرا ماضی جانتے ہوئے بھی تم ایک فاش غلطی کرنا چاہتی ہو۔ یہ سب اپنے ساتھ برا کرنے کے مترادف ہے۔" وہ اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"برا میں کر رہی ہوں۔ عباس اچھا ہے پر میرا آئیڈیل نہیں ہے۔ میرا آئیڈیل اچھا انسان نہیں ہے میرا آئیڈیل برا انسان ہے۔ میں برے مرد سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔" اس کی بات پر وہ گڑبڑا سا گیا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت کے منہ سے ایسی عجیب و غریب بات سنی تھی۔ وہ جانے لگا تھا۔ تب اس نے اس کی آواز سنی تھی۔

"میں عباس کے علاوہ ہر کسی سے شادی پر تیار ہوں عباس سے کسی صورت نہیں۔" اس کی بات میں چھپے مفہوم کو وہ جان گیا تھا۔ اس لڑکی کا انکار اسے دوست کی نظروں میں گرانے کے لیے کافی تھا۔

♥ ♡ ♥

جس قسم کی صورت حال پیدا ہوئی تھی اس نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ عباس کے ساتھ وہ اتنا بڑا دھوکہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پل پل کی بے قراری بے چینی کی خبر تھی اسے۔ اس کے دل کے بہت سے رازوں کا امین تھا وہ پھر وہ کیسے اس کے ساتھ بددیانتی کر سکتا تھا۔ وہ اسے کسی صورت دھوکہ نہیں دینا چاہتا تھا چاہے اس کے لیے اس لڑکی کا دل ہی کیوں نہ توڑنا پڑے۔ لیکن وہ دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے دل توڑنے سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو۔ عباس کو کوئی شک ہوئے بغیر یہ معاملہ باآسانی حل ہو جائے۔ لیکن اس لڑکی کی ہٹ دھرمی اس کے لیے بڑا مسئلہ پیدا کر سکتی تھی۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اسے منانے کے لیے اسے رضامند کرنے کے لیے اگر اسے اس کے قدموں میں بھی جھکنا پڑا تو وہ یہ بھی کر لے گا۔ اس ارادے کے ساتھ ہی اس نے اس سے ملنے کا سوچا تھا۔

وہ پلے گراؤنڈ میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ لڑکیاں کافی تعداد میں باہر نکل آئی تھیں۔ وہ پلے گراؤنڈ میں بیٹھا دور سے اسے دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بھیڑ چھٹ رہی تھی۔ چھٹی ہوئے تقریباً پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ اس نے رسٹ واچ پر ایک نگاہ ڈالی تھی۔ اس قدر طویل انتظار سے وہ اکتا گیا تھا۔ پچھلے پینتالیس منٹ سے وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اسے باہر گیٹ سے نکلتی دکھائی دی تھی۔ وہ اٹھ کر گراؤنڈ سے نکلنے لگا تھا۔ اس کے قدم تیزی سے اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ گراؤنڈ سے نکل کر وہ شفاف سڑک پر آیا تھا۔ پھر تقریباً بھاگتے ہوئے وہ اس کے پیچھے گیا تھا۔ قدموں کی دھمک پر وہ بے ساختہ مڑ کر دیکھنے لگی تھی۔ لیکن اس پر نظر پڑتے ہی وہ پھر سے رخ موڑ کر چل پڑی تھی۔

"بات کرنی ہے مجھے۔" اس کی گمبھیر آواز پر وہ رکی نہیں تھی۔

"مجھے نہیں کرنی بات۔" وہ سپاٹ انداز میں کہہ اٹھی تھی۔

"پلیز یہاں بیٹھ کر میری بات سنو۔" اس نے ایک سرسبز گھاس کے میدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں سننی مجھے۔" اس کی ہٹ دھرمی دیکھنے کے لائق تھی۔

"مجھے عباس کی نگاہوں میں گرا کر تمہیں کیا ملے گا۔" اس کے ٹھہرے اور پتھریلے لہجے پر وہ بے ساختہ رک گئی تھی۔ پھر اس کی سپاٹ نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئی تھیں۔

"میں نے کہا تھا کہ تم عباس کو اپنے انداز سے میری محبت کی شکل میں پیش کرو۔ اسے میری محبت میں مبتلا کرو۔ عباس تمہارا پرابلم ہے۔ تم ہی اسے حل کرو۔" قطعیت سے کہتی وہ کترا کر جانے لگی تھی جب اس کا بازو تھام کر اسے اپنے سامنے کھڑا کرتے ہوئے وہ بہت خشک انداز میں کہہ گیا تھا۔

"تم جانتی ہو کہ تمہارے انکار سے اس کی کیا حالت ہو سکتی ہے؟"

اپنا بازو اس کے ہاتھ سے چھڑا کر اس نے بہت پرنم آواز میں کہا تھا۔

"میں اپنا ٹرانسفر کروا لوں گی۔ یہاں سے چلی جاؤں گی۔ جب میں نہیں رہوں گی تو تمہارا کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔" اس کے لہجے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں بھی پرنم تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک خاموش نگاہ ڈال کر وہ مزید بنا کچھ کہے چلا گیا تھا۔

♥ ♡ ♥

عباس اس کے گھر پروپوزل بھیجنا چاہتا تھا۔ وہ بار بار اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں زائرہ سے بات کرے۔ کیونکہ اب اس کی جاب بھی تھی۔ وہ بہت ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر وہ کیا کرے۔ ادھر وہ اس کی بات سمجھ نہیں پا رہی تھی ادھر عباس کچھ اور سوچ رہا تھا۔

رات کو بستر پر لیٹے وہ انہی سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے اس کی سوچوں میں رخنہ ڈال دیا تھا۔

"یس کم ان۔" آنے والے کو دیکھتے ہی وہ بڑی پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ سائیڈ ٹیبل کے اوپر دودھ کا گلاس رکھ کر وہ بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی تھیں۔

"نیند نہیں آ رہی؟" ان کی خوب صورت آواز اس کے آس پاس بکھری تھی۔

"ہاں کوشش تو بہت کر رہا ہوں پر......" اس نے مایوسانہ انداز میں کہتے ہوئے گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے؟ مجھ سے کہو۔" ان کی نرم و ملائم آواز اسے ڈھارس دیتی محسوس ہوئی تھی۔

"کچھ خاص نہیں بس۔" وہ خاموش ہوا تھا۔ وہ دھیمے انداز میں مسکرائی تھیں۔ کچھ توقف بعد بولی تھیں۔

"مجھ سے چھپا رہے ہو۔ کہو کیا پریشانی ہے؟" ان کی سوالیہ نظریں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ مزید چھپانا نہیں چاہتا تھا اس لیے بول اٹھا تھا۔

"زائرہ کا میں نے بتایا تھا نا آپ کو۔ ہمارے گاؤں کے مڈل اسکول کی ٹیچر ہے۔" وہ انہیں اس کے بارے میں سرسری طور پر بتا چکا تھا۔

"ہاں کیا ہوا اسے؟" وہ پرتشویش انداز میں فوراً کہہ اٹھی تھیں۔

"کچھ نہیں وہ......" وہ ایک بار پھر خاموش ہوا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بات کہاں سے شروع کرے۔

"یازان کہو کیا بات ہے؟" اب کی بار ان کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اور نہج پر سوچ رہی ہوں۔ دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ بہت ٹھہرے اور دھیمے انداز میں کہنے لگا تھا۔

"عباس زائرہ سے محبت کرتا ہے۔ وہ اس کے گھر پروپوزل بھیجنا چاہتا ہے وہ مجھ سے زائرہ کی رضامندی لینے کی بات کر رہا ہے۔ جبکہ زائرہ رضامند نہیں ہے وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ آخر کیا کیا جائے۔" اس کی خاموشی پر وہ بولی تھیں۔

"عباس اچھا لڑکا ہے تم اسے راضی کرو......" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے پھر سے بول اٹھا تھا۔

"وہ مان نہیں رہی۔"

"کیوں؟" ان کے سوال پر وہ خاموش ہوا تھا۔ وہ اس کی خاموشی کو بھانپتے ہوئے کچھ دیر بعد نہایت پرسکون محبت آمیز لہجے میں بولی تھیں۔

"وہ تم سے محبت کرتی ہے؟" ان کے اچانک کیے

جانے والے سوال نے اسے نروس کر دیا تھا۔

"ہاں۔" پھر یکدم سے وہ وضاحت آمیز انداز میں کہتا بولا تھا۔

"یقین کریں آج تک میں نے اسے کبھی اس انداز سے نہیں سوچا' دیکھا۔ نہ ہی آج تک میں نے اس سے ایسی کوئی بات کہی کہ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ میں اس میں کوئی دلچسپی لے رہا ہوں یا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اگر اسے عزت دی ہے تو صرف اور صرف عباس کے حوالے سے کہ وہ اسے چاہتا ہے۔ لیکن اب وہ معاملہ کچھ اور ہو گیا ہے۔ میں دونوں کے بیچ گھن چکر بن گیا ہوں۔ وہ لڑکی کسی قیمت پر نہیں مان رہی۔ اور عباس اس کی محبت میں.... چچی جان یقین کریں کہ عباس کے ساتھ میں نے کوئی فراڈ نہیں کیا۔ وہ لڑکی خود بخود میری جانب.... پتہ نہیں کیسے ہوا یہ سب مجھے خود...." وہ اس لمحے بھی بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی الجھن بلقیس کو صاف نظر آ رہی تھی۔ ان کے ساتھ اپنا مسئلہ شیئر کر کے وہ کچھ کچھ بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔

"تم اسے عباس کے بارے میں تفصیلاً بتا دو۔ اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو پھر عباس کو دھیرے دھیرے سمجھانے کی کوشش کرو کہ وہ اس لڑکی کو بھول جائے۔ اگر وہ اس کے لیے خطرناک حد تک سنجیدہ ہو گیا تو معاملہ بگڑ سکتا ہے۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔ اگر عباس کو پتہ چلے تو وہ مجھے دھوکے باز تصور کرے گا۔ جبکہ میرا قصور تو...." اس کا جملہ کاٹتے ہوئے وہ بڑے رسان سے بولی تھیں۔

"تم نے اسے دھوکہ نہیں دیا۔ جب تمہارا ضمیر مطمئن ہے اس بات پر تو پھر خوامخواہ کی پریشانی مت بڑھاؤ۔ انشاء اللہ بہتر ہی ہو گا۔ تم ان دونوں سے بات کر کے دیکھ لو۔ اس کے بعد جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" وہ اٹھ گئی تھیں پھر جاتے جاتے پلٹ کر بولی تھیں۔

"بار بار مجھے وضاحتیں مت دو۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا بیٹا اس لڑکی کو کبھی تکلیف نہیں پہنچا سکتا اور نہ ہی کبھی اپنے دوست کو دھوکہ دے سکتا ہے۔ وہ لڑکی کم عمر ہے۔ ناسمجھ ہے۔ اور یہ تمہاری خطا نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ اس کے کمرے سے چلی گئی تھیں۔ ان کے آخر میں کہے جملے اس کی طبیعت پر بہار کے موسم کی طرح مختلف رنگ بکھیر چکے تھے۔ وہ ہلکا پھلکا ان کے آخری جملوں کے سحر میں گرفتار ہونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

شام کے وقت وہ لان میں بیٹھا چائے پی رہا تھا جب وہ اس کے پاس آئی تھیں اس کے قریب پڑی کرسی گھسیٹ کر وہ اس کے نزدیک بیٹھ گئی تھیں۔ وہ ان پر ایک نگاہ ڈال کر دھیرے سے مسکرایا تھا۔ اس وقت وہ نہا کر کافی فریش سا لگ رہا تھا۔

"اس لڑکی سے بات کی تم نے یا عباس سے۔"

"نہیں ابھی تک تو ان دونوں سے بات نہیں کی میں نے۔ ارادہ ہے میرا آج جاؤں گا زائرہ سے ملنے۔ آپ دعا کیجئے کہ وہ کچھ سمجھ پائے میری بات۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہتا پاس آتی سحر کو دیکھنے لگا تھا۔

"بھائی آپ کا فون ہے؟" کہتے ہی وہ مڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ بھی اٹھ گیا تھا۔

"چچی جان صبا سے کہنا کہ میں رات کو اسے Maths پڑھاؤں گا۔" اس کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ اندر کی جانب بڑھا تھا۔ فون پر بات کر کے وہ گھر سے نکلا تھا۔ آج اس نے زائرہ سے ہر حال میں بات کلیئر کرنے کا سوچا تھا۔ کچھ دور تک جانے کے بعد وہ واپس گھر آیا تھا۔ لمبی ڈرائیو پر جانے کے خیال کے تحت اس نے گاڑی نکالی تھی۔ گاڑی کے ہارن پر سلطانہ آنٹی نے گیٹ کھول کر باہر جھانکا تھا۔ پھر وہ باہر نکل کر اس کے پاس آئی تھیں۔

"عباس تو گھر پر نہیں ہے۔" انہوں نے اطلاع پہنچائی تھی۔ جس سے کہ وہ باخبر تھا۔

"میں زائرہ سے ملنے آیا تھا۔ دراصل اس نے گیس کمپنی چکر لگانے کا کہا تھا۔ آج میں نے سوچا کہ اسے وہ جگہ دکھا ہی دوں۔ پھر کچھ دن کے لیے میں شہر جا رہا ہوں۔" اس نے من گھڑت کہانی سوچ کر بتا دی تھی۔

"تم ذرا سا انتظار کرو۔ میں اسے بلاتی ہوں۔" وہ خوش دلی سے مسکرا کر اندر چلی گئی تھیں۔ وہ اس کا انتظار کرنے لگا تھا۔ دس منٹ بعد وہ آئی تھی۔ آتے ہی اس نے گاڑی کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اور بیٹھ کر وہ بڑی لاپرواہی سے باہر کی جانب دیکھنے لگی تھی۔ اس نے بنا کچھ کہے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ طویل خاموشی کے بعد وہ بولا تھا۔

"ہم جس سے محبت کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ وہ ہمیں ملے بھی...." اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ یکدم کہہ اٹھی تھی۔

"ہاں یہ بات' تم اپنے دوست سے کہو۔" اس کا پرسکون انداز اس پل اسے بے سکون کر گیا تھا۔

"تم مجھ سے میرا دوست چھین رہی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں کر رہی ہو تم۔ آخر عباس میں کمی کیا ہے۔ ضروری نہیں کہ محبت شادی سے پہلے ہو۔ شادی کے بعد بھی ہو سکتی ہے' تمہیں اس سے محبت ہو جائے گی۔ شادی کے بعد تم یہ بھول جاؤ گی کہ تم کسی سے...."

"تم نے مجھے کیوں بلایا تھا؟" اس نے گردن موڑ کر اب کی بار اسے سپاٹ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے اس فضول سوال نے اسے خاصا تپا دیا تھا لیکن وہ ضبط کر گیا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم عباس کے ساتھ...."

"اگر ہمارے بیچ یہی موضوع بات کرنے کو رہ گیا ہے تو پھر آئندہ مجھ سے مت ملنا۔ میرا جواب کل آج اور ہمیشہ کے لیے نہ ہے۔ تم میرا فیصلہ کسی صورت بدل نہیں سکتے۔ میں کمپرومائز کرنے پر ہرگز ہرگز یقین نہیں کرتی۔ کمپرومائز صرف اسی صورت کر سکتی ہوں کہ میں عباس کو سب سچ سچ بتا دوں۔ اور ایسا تم نہیں چاہو گے۔ کیونکہ تم نہیں چاہتے کہ تمہارا دوست تمہیں دھوکے باز یا خود غرض سمجھے۔" وہ ایک ایک بات پر زور دیتی نہایت دھیمے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"تم اسے اپناؤ جو تمہیں چاہتا ہے۔ اسے مت اپناؤ جو تمہیں نہیں چاہتا۔" اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی سخت ہوا تھا۔

"میں اسے ہی اپنانا چاہتی ہوں جو مجھے چاہتا ہے۔" وہ طمانیت سے کہتی اسے بھڑکا گئی تھی۔

"تو وہ صرف عباس ہے۔" اس نے سخت لہجہ استعمال کیا تھا۔

وہ استہزائیہ ہنسی ہنس دی تھی۔ کچھ پل بعد وہ بڑی بوجھل اداس آواز میں کہہ رہی تھی۔

"یازان میں کوئی گفٹ نہیں جسے تم پیک کر کے اپنے دوست کے سامنے پیش کرو۔ اپنے دوست کے جذبات و احساسات کو فوقیت دے کر تم مجھے جلتی آگ کی بھٹی میں نہیں جھونک سکتے۔ ٹھیک ہے کہ میں تمہارے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی پر میں ایک انسان بھی تو ہوں۔ تم دوستی کی دیوار اونچی کرتے کرتے اس کی بنیاد کمزور مت کرو ورنہ یہ دیوار دھڑام سے نیچے گر پڑے گی تب بہت چوٹیں، بہت زخم آئیں گے جسم پر' روح پر' عباس کا ساتھ سوائے اذیت دینے کے مجھے کچھ نہیں دے سکتا۔ میں بہت واضح الفاظ میں کہہ رہی ہوں تم سے' عباس کے ساتھ رہ کر مجھے تم یاد آؤ گے۔ یہ یاد منافقت ہے۔ منافقت ہو گی اس شخص کے ساتھ' تمہارے لیے میں اس شخص کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔ کیونکہ وہ ایک شریف انسان ہے۔ وہ شریف اور نیک ہے یہ تم خود تسلیم کرتے ہو۔ اس نیک بندے کے ساتھ تم اس قدر دھوکہ کرو گے یہ بھی قطعاً" ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے تم اسے کہہ دو کہ میں یازان سے محبت کرتی ہوں اگر وہ مجھے اپنا لیتا ہے تو ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس کی بات ناممکن تھی۔ وہ ایک نہایت چالاک لڑکی تھی اسے یقین ہونے لگا تھا۔ کس شرط پر اس نے اسے لا کھڑا کیا تھا۔ وہ گاڑی روک چکا تھا۔ گاڑی سے نکل کر وہ ایک ہموار میدان میں اتر گیا تھا۔ وہ ایک خشک میدان تھا۔ جہاں گھاس وغیرہ بالکل نہیں تھی۔ کہیں کہیں کیکر کے درخت نظر آ رہے تھے۔ ایک قدرے موٹے کیکر کے درخت کے نیچے وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ وجہ حد سے بڑھا اشتعال تھا جس پر اسے قابو پانا تھا۔ وہ اس لڑکی سے کوئی سخت بات کہنا

نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسے مار نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنے قریب آتے دیکھ کر وہ نیچے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بھی قریب آکر پاس بیٹھ گئی تھی۔

"کل سے ہماری چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ ہم دونوں کے بیچ فی الحال یہ آخری ملاقات ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ پھر ملیں گے۔ لیکن یہ ڈیپنڈ کرتا ہے کہ تم مجھ سے ملتے ہو یا نہیں۔ تمہارے دوست کے لیے میں دعا ہی کر سکتی ہوں۔" وہ قصداً نظریں دوسری جانب مرکوز کیے بیٹھا تھا۔ وہ اس کی ناراضگی کو بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھی لیکن وہ بھی مجبور تھی اس لیے اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔

"مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ مجھ میں قربانی کے جذبات ابھی تک اس حد تک نہیں بڑھے کہ میں اپنے مفاد پر کسی اور کے مفاد کو ترجیح دوں۔ میں معصوم نہیں ہوں مفاد پرست ہوں۔ اب تو تمہیں یقین آ رہا ہو گا کہ دنیا میں کس کس طرح کے گناہ گار لوگ بستے ہیں۔ لیکن میری بھی ایک مجبوری ہے کہ میں دوغلی بن کر زندگی نہیں گزار سکتی۔ میرے دل میں تم ہو پر میں کسی اور کے ہونے کی ایکٹنگ کروں۔ یہ میرے لیے ناممکن ہے۔ چلنے دو بس یونہی۔ گزر جائے گی زندگی۔" اس نے بہت عجیب اور بہت ملول سے انداز میں کہا تھا۔ اس نے آج تک اس قدر بناوٹ سے پاک عورت نہیں دیکھی تھی۔ جو بات اس کے دل میں تھی وہ بول دیتی تھی۔ بالکل واضح اور کھری۔ چاہے اس بات سے خود اس کی انا ہی کیوں نہ ہرٹ ہوتی ہو۔

وہ بالکل خاموش سا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ چونکا جب تھا جب اس نے اپنی کلائی پر اس کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کیا تھا۔ اس کا دھیان، اس کی نظریں کلائی پر جمے ہاتھ پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ اس نے اس کی رسٹ واچ اتاری تھی۔ وہ استعجابیہ نظروں سے دیکھتا بالکل خاموش تھا۔ وہ بھی کچھ کہہ نہیں رہی تھی۔ رسٹ واچ اتار کر اس نے اپنے ہاتھ میں دبالی تھی۔ اور پھر دوسری جانب دیکھنے لگی تھی۔

"تم کسی صورت نہیں مانو گی۔" وہ بہت تھکے پژمردہ لہجے میں بولا تھا۔

"نہیں۔" اس نے یکدم سے انکار کرتے ہو نفی میں سر ہلایا تھا۔

"میری خاطر بھی نہیں۔" اس نے بڑی آس پوچھا تھا۔

"نہیں۔" اس نے بالکل کورا جواب دیا تھا۔ ا کی ساری امیدیں ٹوٹنے لگی تھیں۔

"عباس سے کیا کہوں میں؟" وہ بڑی بے بسی کہتا بہت الجھتا ہوا دکھائی دیا تھا۔

"یہ تمہارا ہیڈک ہے۔ زائرہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" دو ٹوک انداز میں کہہ کر وہ اٹھ گئی تھی بھی کچھ پل بعد اٹھ گیا تھا۔ گاڑی میں واپسی دوران بھی وہ خاموش رہے تھے۔ اس کی رسٹ وا ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہی دبی تھی۔ اسے اتارتے ہوئے اس نے اس کے اترنے سے پہلے تھا۔

"میں تمہارا ٹرانسفر کرواؤں گا اس کے لیے مجھ معاف کر دینا۔" اس کے سپاٹ الفاظ پر وہ اطمینان سے بولی تھی۔

"اپنے دوست کے لیے تم میرا اس دنیا سے تو ٹرانسفر نہیں کروا سکتے۔ ان چھوٹے معمولی ٹرانسفرز کا میں نہیں مانتی۔ یہ اس کا حق بنتا ہے۔" کہتے ہی وہ گاڑی ڈور کھول کر اتر گئی تھی۔ اس کے گھر میں داخل ہو کے تقریباً دس منٹ بعد وہ گہری سوچوں سے نکل کر گاڑی اسٹارٹ کر پایا تھا۔ اس کی رسٹ واچ وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

♥ ♡ ♥

گرمیوں کی چھٹیوں کے باعث اسکول بند ہو گئے تھے۔ وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔ لیکن اس شخص کو ہزاروں سوچوں میں مبتلا کر کے۔ عباس کے گھر والے بھی سنجیدگی سے اس کی شادی کا سوچ رہے تھے۔ اس کی والدہ نے اس کے لیے لڑکیاں ڈھونڈنی شروع کر دی

نہیں۔ عباس بہت ڈسٹرب تھا۔ وہ یازان پر خفا ہو رہا تھا کہ اس نے ابھی تک زائرہ سے اجازت کیوں نہیں لی کہ وہ اپنے گھر والوں کو ان کے گھر بھیج دے۔ وہ عجیب مشکل میں پھنسا تھا۔ عباس کو وہ بارہا یہ بتا چکا تھا کہ زائرہ اس کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ وہ اس میں انٹرسٹڈ تھی۔ وہ مذاق مذاق میں اسے زائرہ کا نام لے کر اکثر چھیڑا کرتا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن اب جس قسم کی صورت حال پیدا ہوئی تھی ایسے میں وہ کیسے عباس سے کہہ دیتا کہ اس نے اس وقت جو کچھ محسوس کیا تھا وہ ایک غلط فہمی تھی۔ وہ لڑکی عباس سے اتنی ہی لاتعلق تھی جتنا کہ وہ یازان اس لڑکی سے۔ اس گمبھیر مسئلے کو کیسے حل کیا جا سکتا تھا۔ وہ بے بسی سے سوچتا رہتا تھا۔ عباس کو پچھلے ایک مہینے سے وہ ٹالتا رہا تھا۔ اب وہ مزید اسے نہیں ٹال سکتا تھا۔ تنگ آکر اس نے صاف صاف بات کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ تھک گیا تھا اس صورت حال سے۔

وہ عباس کے کمرے میں بیٹھا بہت مضطرب اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"تم کچھ پریشان سے ہو کوئی مسئلہ ہے کیا؟" الماری سے کپڑے نکال کر وہ نہانے واش روم جا رہا تھا۔

"تم شاور لے لو پھر بات کریں گے۔" سنجیدگی سے کہہ کر وہ اٹھ کر باہر آیا تھا۔ وہ پودوں کے پاس کھڑا ایک ایک پتے کو چھو کر اس کی تر و تازگی کو محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر تک سلطانہ آنٹی سے بات چیت ہوتی رہی پھر وہ واپس اس کمرے میں آیا تھا۔ اس کے بیڈ پر نیم دراز ہو کر اس نے تکیے کے پاس پڑی اس کی ڈائری اٹھا کر کھول دی تھی۔ وہ ڈائری عباس کئی بار اسے پڑھا چکا تھا۔ وہ اس سے کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ اور نہ ہی کبھی یازان نے اس سے کوئی بات چھپائی تھی۔ بیشتر بار پڑھی جانے والی یہ ڈائری آج وہ پڑھ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے پہلا صفحہ کھولا تھا۔ وہاں کئی جگہ لکھا نام نظر آتے ہی یکدم اس نے ڈائری بند کر دی تھی۔ بستر پر پھینک کر وہ ڈائری کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ خود کو

عباس کی محبت اس کے احساسات و جذبات کا قاتل سمجھنے لگا تھا۔ یہ بحث فضول تھی کہ ایسا اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ قتل قتل ہوتا ہے۔ چاہے قصداً ہو یا غلطی سی۔ وہ قاتل بن چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ وہ تولیے سے بال رگڑتا نکلا تھا۔ تولیہ کرسی پر پھینک کر وہ بیڈ کے کنارے بیٹھ کر جوتے اٹھا کر پہننے لگا تھا۔

"چائے نہیں آئی ابھی تک۔" اس نے مصروف انداز میں سر جھکائے کہا تھا۔ اس کی نظریں اس کے کھلے تر و تازہ چہرے پر ٹکی کچھ پل بعد پیدا ہونے والی رنجیدگی اور سنجیدگی کو محسوس کر رہی تھیں۔ جوتے پہننے کے بعد وہ ڈریسنگ ٹیبل پر سے پرفیوم اٹھا کر اپنے لباس پر چھڑکنے لگا تھا۔ آج وہ اسے اس کی محبت کی موت ہونے کا پیغام دینے جا رہا تھا۔ کسی کو یہ اطلاع دینا نہایت مشکل اور پیچیدہ امر ہوتا ہے۔ عباس کو یہ کہنا مشکل تھا کہ جس کے نام کو اس نے خون سے لکھا تھا وہ اس کا نام سننے کی روادار نہیں تھی۔ عباس باہر گیا تھا کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تھا۔

"فضل کی چھٹیاں نہیں ہو رہیں ورنہ اسے بھی ساتھ لے جاتے۔" عباس چترال جانے کا پروگرام بنائے بیٹھا تھا انہیں پرسوں روانہ ہونا تھا۔ فضل ان کا دوست تھا جو شہر میں رہتا تھا۔ اس وقت وہ اس کے متعلق بات کر رہا تھا لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ راشدہ چائے لے کر آئی تھی۔ دونوں کو کپ پکڑا کر وہ چلی گئی تھی۔

"عباس۔" اسے اپنے قریب بیٹھے دیکھ کر وہ بڑی سنجیدہ اور دھیمی آواز میں بولا تھا۔ وہ بڑے عام سے تاثرات سمیت اس کی طرف دیکھتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پر سے کپ اٹھا کر چائے کا سپ لینے لگا تھا۔

"عباس زائرہ نے پروپوزل بھیجنے سے منع کیا ہے۔" اپنی بات پر اس نے اس کے ہاتھ میں تھامے کپ کو لرزتے دیکھا تھا۔ اس کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں اس کے چہرے کی رنگت خطرناک حد تک بدل گئی تھی۔

"کیوں؟" کتنی دیر کی خاموشی کے بعد آواز بمشکل

اس کے حلق سے نکلی تھی۔

"پتہ نہیں پر وہ منع کر رہی ہے۔" وہ حقیقت بتانے کی جرات پیدا نہ کر سکا تھا۔

"کوئی تو وجہ بتائی ہو گی اس نے۔" اس کے چہرے پر سایہ سا لہرا رہا تھا۔

"وجہ۔" وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اگر وہ اسے صاف بات نہ بتاتا تو بات الجھی رہتی۔ وہ اس آس میں مزید عشق کی وادیاں پھلانگتا بہت گہرائی میں اتر جاتا۔ جب وہ ہر صورت اس کے ساتھ سے انکاری تھی تو اسے مزید خوش فہمی میں مبتلا رکھنا مروا ڈالنے کے مترادف تھا۔

"شاید وہ کسی اور سے..... شاید وہ کسی اور کو پسند کرتی ہو اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہو۔" اس کی بات پر وہ گم صم ہو گیا تھا۔

"کون ہے وہ۔" کافی دیر بعد اس کے لبوں سے الفاظ بر آمد ہوئے تھے۔

"پتہ نہیں، میں نہیں جانتا۔ ضروری نہیں کہ ایسا ہو یہ میرا خیال ہے۔" اچانک اس نے پینترا بدلا تھا۔ اس نے عباس کی نظروں کو خود پر مرکوز پایا تھا۔ وہ نروس ہونے لگا تھا۔

"یہ تمہارا خیال ہے یا اس کے الفاظ ہیں۔" اس کے لہجے سے شبہے کی بو آ رہی تھی۔

"اس کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے میں نے مطلب اس کے الفاظ سے میں نے جانا کہ وہ کسی....."

"تمہارے اس اندازے نے یہ اندازہ تو لگا لیا ہو گا کہ وہ یقیناً "کسی سے محبت کرتی ہے۔" اس کے ہلکے طنز کو اس نے تمام تر شدت سے محسوس کیا تھا۔ وہ بے یقین ہونے لگا تھا۔ یازان کو اس کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"ڈھکے چھپے الفاظ میں ہی کہا اس نے کہ وہ کسی سے محبت کرتی ہے۔" اس نے اب کی بار اپنا لہجہ مضبوط بنانے کی سعی کرتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ کسی کون ہے؟" کپ رکھ کر وہ اٹھتے ہوئے بولا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا تھا۔ اسے چائے پینی تھی وہ بھول گیا تھا۔ وہ پاس کھڑے عباس کے بدلے تیور پر حیران و پریشان تھا۔

"اس نے یہ بتا دیا کہ اسے کسی سے محبت ہے پر نہیں بتایا کہ کس سے ہے۔" اس کا لب و لہجہ "کچھ ہے" کا اعلان کر رہا تھا۔ اس کے طنز کو وہ ایک بار پھر پی گیا تھا۔

"نہیں میں یہ کہہ چکا ہوں کہ اس نے واضح طور پر یہ نہیں کہا۔ میں نے اپنی....."

"اس نے یہ نہیں بتایا کہ اسے یازان سے محبت ہے۔" اب کی بار وہ بات کھول کر رکھ چکا تھا۔ وہ نظریں ملا نہیں پایا تھا۔ پھر یکدم سے بولا تھا۔

"تم کیا کہہ رہے ہو۔ تمہیں اس کا اندازہ ہے۔ تمہیں خبر ہے کہ میں نے ہمیشہ اسے تمہارے حوالے سے بہت عزت دی ہے۔ جو بات تم کر رہے ہو وہ مجھے توہین محسوس ہو رہی ہے۔ اس احترام کی جو میں کرتا آیا ہوں۔" وہ بہت بگڑے انداز میں کہہ کر اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

"تم غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو اور کچھ نہیں۔"

"غلط فہمی ہو رہی ہے مجھے۔ اسے "کسی" سے محبت ہے۔ وہ کسی تم نہیں ہو سکتے۔" وہ بڑی تیز اور تند آواز میں بولا تھا۔

"میں نہیں ہوں۔" وہ بھی تیز آواز میں کہہ گیا تھا۔

"تم نہیں ہو۔ جاؤں پوچھوں اس سے قسم کھا کر کہو کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ تم اس سے محبت نہیں کرتے۔" وہ بہت چبھتے ہوئے لہجہ میں کہہ رہا تھا۔

"ایسا نہیں ہے۔" وہ ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ عباس اچانک اس کی شرٹ کی جیب سے چابیاں نکال کر ٹھوس لہجے میں بولا تھا۔

"ٹھیک ہے میں ابھی جا کر اس سے پوچھتا ہوں۔" وہ بڑی سرعت سے مڑ کر جانے لگا تھا۔ اس نے اس کی شرٹ کھینچ کر اسے روکا تھا۔

"تم غلط کر رہے ہو۔" وہ غصے کو دباتے ہوئے بولا تھا۔

"میں ٹھیک کرنے ہی جا رہا ہوں۔ اب جانے دو

مجھے۔" وہ اپنا بازو چھڑا کر آگے بڑھنا چاہتا تھا لیکن بڑھ نہیں پایا تھا۔

"تسلیم کرو کہ جو میں سمجھ رہا ہوں وہ صحیح ہے۔" عباس طنزیہ آواز میں کہتا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہا تھا۔

"عباس ہم اسے راضی کر لیں گے وہ تم سے شادی پر تیار ہو جائے گی۔ ویسے بھی ابھی میں نے اس سے حتمی جواب نہیں لیا ہے میں....."

"تسلیم کرو کہ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔" وہ چلایا تھا۔ یکدم اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا تھا۔ "پلیز تمہاری بہنیں ماں وغیرہ سن لیں گی۔" وہ گھبرا گیا تھا اس صورتحال سے۔ "میں اس سے محبت نہیں کرتا" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

"تم یہ قیامت تک تسلیم نہیں کرو گے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ تم یہ کہو کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے یا نہیں۔" انگلی اٹھا کر اس نے حتمی جواب مانگا تھا۔

"عباس یہ فضول کی بحث ہے۔ وہ میری دوست تھی اور بس۔" اس نے بہت عاجزانہ انداز میں صفائی دینے کی کوشش کی تھی جسے خاطر میں نہیں لایا گیا تھا۔

"وہ تم سے محبت کرتی ہے یا نہیں۔" وہ دو ٹوک بات کرتے ہوئے ایک بار پھر بول اٹھا تھا۔

"ہاں کرتی ہے۔" اپنا بے خوف لہجہ اسے خود اچھا نہیں لگا تھا۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ اسے یقین دلاتی نظروں سے تکتا کہنے لگا تھا۔ "یقین کرو عباس میں اس میں انوالو نہیں ہوں۔ میں نے کبھی ایسا سوچا نہیں تھا کہ وہ مجھ سے..... میں اسے سمجھا لوں گا۔ بلکہ ہم دونوں اسے....." خشمگیں نگاہوں سے دیکھتا ہوا وہ اپنے کندھے پر سے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بڑے سخت لہجے میں بول اٹھا تھا۔

"جھیل کے کنارے جو کچھ تم دونوں کے درمیان ہوا تھا۔ اس پر میں اپنے دل کو یہ تسلی دے کر خود کو بہلاتا رہا تھا کہ وہ خوف کا شکار تھی۔ چونکہ تم سے بے تکلف تھی اس لیے تمہیں سامنے پا کر تمہارے..... اگرچہ اس وقت بھی میرے دل میں شک کے ناگ نے سر ابھارا تھا۔ جسے میں نے وقتی حادثہ سمجھ کر خود کو بہلاوے دے کر دبا دیا تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ سب خوف کے باعث نہیں تھا۔ بلکہ تم دونوں کی محبت تم دونوں کی بے تکلفی ساری حدود کو توڑ گئی تھی۔ اب مجھے اس کا اندازہ ہو رہا ہے۔ میں تم دونوں کے تعلق کو دوستی سمجھتا رہا۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ تم دونوں کے درمیان وہ تعلق کیا دلی اور جسمانی....." اس کی بات پر وہ مزید چپ نہ رہ سکا تھا۔ اس کا ضبط جواب دے گیا تھا تبھی چلاتے ہوئے بولا تھا۔

"شٹ اپ عباس شرم آنی چاہیے تمہیں۔ تم کیا بک رہے ہو تمہیں اس کا احساس ہونا چاہیے۔ ہمارے بیچ ایسا کچھ نہیں ہے۔ حقیقت وہی ہے جو تم پہلے سمجھتے رہے ہو۔ تمہاری اب کی سوچ نہایت گھٹیا ہے۔"

"گھٹیا ہے۔" وہ اس کے بالکل سامنے کھڑا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑی کرخت آواز میں بولا تھا۔

"تمہیں میری محبت کا علم تھا۔ اس کے لیے میرے کیا احساسات تھے تمہیں اس کی آگاہی تھی۔ پھر بھی تم ہمارے بیچ آ گئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس کی محبت میں غرق ہو کر اسے اپنی محبت کا یقین دلا کر اسے اپنی جانب متوجہ کرو گے۔ کچھ ایسا کیا ہو گا تم نے کہ جس سے وہ تمہاری جانب مائل ہو گئی۔ کچھ ایسا احساس دلایا ہو گا کہ وہ تمہاری محبت میں مبتلا ہوئی ہے۔ تمہارا دل بے ایمان ہو گیا تھا۔ تم نے دوستی کے نام پر میری پیٹھ پر چھرا گھونپا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ کرو گے۔" وہ آخری جملہ بڑے کرب آمیز انداز میں کہہ گیا تھا۔

"یازان۔" وہ نہایت اداس و ملول نگاہوں سے دیکھتا کہنے لگا تھا۔

"میں یہ کبھی بھی بھول نہیں سکتا کہ دوستی کی آڑ میں تم نے مجھے اس قدر دھوکہ دیا کہ مجھے ساری زندگی

کا درد دل دے دیا۔ یہ درد دو قسم کا ہے۔ ایک محبت میں ناکامی اور دوسرا دوستی میں ناکامی۔" اس کی آنکھوں میں نمی تھی جسے یازان دیکھ نہیں پایا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ کر وہ اسے جھنجوڑ کر کہنے لگا تھا۔

"عباس پلیز تم غلط سوچ رہے ہو۔ ہم دونوں اسے راضی کر لیں گے وہ مان جائے گی۔ قسم سے میں اس سے محبت نہیں کرتا جو تم سمجھ رہے ہو۔ پلیز عباس تم میرے اور اپنے تعلق کو اس لڑکی کے لیے ختم مت کرو۔ پلیز عباس تم ایسا مت کرو۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میں اس سے کبھی نہیں ملوں گا۔ میرا اس کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ تم یقین کرو کہ میں......" وہ بڑے عاجزانہ لہجے میں اپنی صفائی اور وضاحتیں دے رہا تھا۔

"اب وہ ایک اترن ہے۔ عباس اتنا گیا گزرا نہیں کہ وہ تمہاری اترن......"

"عباس جسٹ شٹ اپ۔" اس نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر مارا تھا۔ جس پر وہ لڑکھڑا کر کچھ قدم پیچھے چلا گیا تھا۔

"ایسا کہتے ہوئے یہ بھی تو سوچو کہ تم اس لڑکی کی پاکیزگی کو داغدار کر رہے ہو۔"

وہ ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوکتے ہوئے کہنے لگا تھا۔

"یہی حقیقت ہے یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی۔ اب جانتے بوجھتے دیکھتے اس لڑکی کو میں کیسے قبول کر لوں۔ تمہاری اس عنایت کو کیسے......" وہ سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بڑے مغموم انداز میں سر جھکا گیا تھا۔

"اس لڑکی کو میں کسی بھی قیمت پر نہیں اپنا سکتا۔ باوجود اس کے کہ میرے لیے اس کے بغیر رہنا سوہان روح ہو گا۔ بہت درد ہو گا مجھے۔ بہت تکلیف مل رہی ہے مجھے اور ملے گی۔ بتا اس لیے رہا ہوں تاکہ کل کو اگر وہ تمہاری بیوی بن بھی جائے تو تمہیں بھی میری طرح ہر قدم پر یہ احساس ہوتا رہے کہ تمہاری بیوی کو تمہارا دوست بہت چاہتا تھا۔" ایک آخری مضبوط وار کر کے وہ اسے نہایت سخت اور چبھتی آنکھوں سے دیکھتا ہوا اس کے پاس سے گزرتا چلا گیا تھا۔ جبکہ وہاں کھڑا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔

اس لڑکی نے ان کی دوستی کا جنازہ نکال دیا تھا۔ زن، زر، زمین چیز ہی ایسی ہے کہ دلوں میں دراڑیں ڈال دیتی ہیں اور ہمیشہ کے لیے جدا کر دیتی ہیں۔ لاتعلق کر دیتی ہیں۔ عباس کی باتوں نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ جو کچھ ہوا وہ سب غلط تھا۔ وہ اس کی باتوں پر کڑھ کر رہ گیا تھا۔ وہ ایک بدقسمت ترین انسان تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس کی قسمت میں خوشی کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں لکھی گئی تھی، وہ سوچ رہا تھا۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہی تو تھی کہ ایک پرخلوص دوست اس سے وہ لڑکی چھین لے گئی تھی۔

♥ ♡ ♥

چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔ ان تین مہینوں میں عباس ایک بار بھی اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ جہاں کہیں اسے دیکھتا کترا کر چلا جاتا۔ وہ کئی بار عباس سے ملنے اس کے گھر گیا تھا۔ باہر گراؤنڈ، باغ، ہر جگہ اس نے اس سے ملنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ صرف ایک ہی جملہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا تھا۔

"ہماری دوستی کو تم اپنے ہاتھوں قبر میں اتار چکے ہو۔" عباس ایسا کیوں کر رہا تھا۔ وہ کئی بار رویا بھی تھا۔ غصے میں آ کر اس نے اسے ٹرانسفر کی دھمکی تو دے دی تھی لیکن اس پر عمل کرنے کا ارادہ اس کا ہرگز نہیں تھا۔ اس لڑکی کا ٹرانسفر اس سے بھی زیادہ دوردراز کے علاقے میں ہو سکتا تھا جو اس کے لیے مسائل پیدا کر سکتا تھا۔ وہ اسے ایسے کسی بھی مسئلے سے دوچار کرنے کی ہمت خود میں پیدا نہیں کر پایا تھا۔

دن رات ایک عجیب سی بے چینی میں گھرا وہ اپنے روز و شب گزار رہا تھا۔ اسے واپس آئے اور اسکول جوائن کیے پندرہ دن ہونے والے تھے۔ وہ اب بھی عباس کے گھر میں رہائش پذیر تھی۔ اسے اس بات کی آگاہی ہرگز نہیں تھی کہ وہ اپنے پیچھے کتنے وجود روند کر چلی گئی تھی۔ یازان کی اس سے ایک بار بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ یا وہ قصداً اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا

جھیل کے کنارے بیٹھا وہ پانی میں چھوٹے چھوٹے کنکر پھینکتا جا رہا تھا۔ پر اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ اس وقت پورے علاقے پر خاموشی کا راج تھا۔ اس گہرے سکوت نے اس کے اندر گہری خاموشی پیدا کر دی تھی۔ اور اداسی اس خاموشی کو مزید بڑھا رہی تھی۔ اسے سکون چاہیے تھا سکون کہیں نہیں تھا۔

"کیسی بددعا دی تھی تم نے مجھے شعوانہ کہ مجھے جیتے جی لاش بنا دیا۔" یکدم سے اس کی آنکھیں بہت نم ہوئی تھیں۔ اسے خود پر ترس آنے لگا تھا۔ اسے خود سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔ اس قدر لاچار، بے بس انسان تھا وہ کہ اسے خود پر رونا آنے لگا تھا۔ وہ رونے لگا تھا۔ پچھلے ساڑھے تین مہینوں کا غبار نکالنے لگا تھا۔ ایک سفید بلی اس سے چار قدم کے فاصلے پر بیٹھی اسے محویت سے تک رہی تھی۔ پھر یکدم سے اس کے نزدیک پڑی مردہ چڑیا کو اٹھا کر بھاگتی چلی گئی تھی۔ بلی کی حرکت پر ہی وہ سر اٹھا کر اپنے آنسو پونچھنے لگا تھا۔ پانی میں پتھر پھینکنے کا عمل پھر سے شروع ہوا تھا۔

"دنیا میں پرفیکٹ کوئی بھی نہیں۔ کسی کو دولت ملتی ہے۔ کسی کو شہرت ملتی ہے۔ کسی کو حسن ملتا ہے۔ کسی کو غریبی ملتی ہے۔ کسی کو بے پناہ عزت و تکریم دی جاتی ہے۔ کسی کو صحت ملتی ہے۔ کسی کو معذوری ملتی ہے۔ کسی کو سکون ملتا ہے۔ کسی کو بے سکونی ملتی ہے۔ مجھے جو چیز ملی ہے اس نے ان سب چیزوں کو پس منظر میں ڈال دیا ہے۔ میرا حسن، میری دولت، میرا رتبہ، میری تعلیم، میری صحت، سب کو ایک بے سکونی نے مجھے قلاش کر دیا۔ کیا ہے یہ زندگی۔ عقل بعد میں کیوں کام کرتی ہے پہلے کیوں نہیں۔ اچھی سوچ پہلے کیوں نہیں آتی تھپڑ کھانے کے بعد کیوں آتی ہے۔ اچھا عمل پہلے ہی کیوں نہیں اپنایا جاتا بعد میں کسی کو مار دینے کے بعد کیا رہ جاتا ہے۔" وہ سر جھکائے خود میں مگن سوچ رہا تھا۔ کوئی اس کے پاس بیٹھ گیا تھا جس کا احساس اسے نہیں ہوا تھا۔

"عباس کیوں ظلم کر رہا ہے خود پر۔ وہ خود کو اذیت کیوں دے رہا ہے۔ کیا وہ اس لڑکی کے بغیر رہ پائے گا۔ اور وہ لڑکی کیا ساری عمر یونہی گزار دے گی۔ کیا میں جانتے بوجھتے اسے یونہی زندگی برباد کرتے دیکھتا رہوں۔ ایک اور گناہ، گناہ میرے ساتھ ہی کیوں چپک گیا ہے۔ کیوں یہ چاہتا ہے کہ میں اسے اختیار کروں۔ بس گناہ پر گناہ کر رہا ہوں۔" پرفیوم کی دھیمی مسحور کن خوشبو آس پاس بکھرنے لگی تھی۔

"عباس اسے نہیں اپناتا میں اسے نہیں اپناتا۔ میں اسے نہیں اپناتا۔ وہ کسی کو نہیں اپناتی۔ وہ مجھے اپناتی ہے۔ اگر میں اسے اپناؤں تو گناہ تو نہیں رہے گا نا مزید۔ میری روح پر کوئی اور بوجھ تو نہیں ہو گا نا میں......"

"کب سے بیٹھے ہو یہاں۔" اس کی سوچ کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ تین مہینے بیس دن بعد وہ اس کی آواز سن رہا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ میں تم سے ملوں گی۔"

"عباس یاد آتا ہے تمہیں۔" اس نے نہایت دھیمی اور غمناک آواز میں سوال کیا تھا۔ وہ اس سوال پر بالکل چپ رہی تھی۔

"تم سے پوچھ رہا ہوں عباس یاد آتا ہے تمہیں۔" اس بے تکے سوال پر وہ کچھ بھی بولنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے خاموش رہی تھی۔ چند لمحے اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے ٹانگیں پھیلا کر نیم دراز ہوتے ہوئے آنکھیں بند کر کے کہا تھا۔

"میرا دوست چھین کر تم نے اچھا نہیں کیا۔ کتنا کنگال کر دیا تم نے مجھے۔" پھر آنکھیں کھول کر اس نے اسے بہت سنجیدہ اور سپاٹ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"میں کل پرپوزل تمہارے گھر بھیج رہا ہوں۔ میری کوئی جاب وغیرہ فی الحال نہیں ہے۔ اگر تمہارے والدین نے انکار کیا تو میں تمہیں کڈنیپ کر لوں گا۔" اس کے سخت الفاظ پر اس کے ہونٹوں پر دھیما سا تبسم پھیل گیا تھا۔ جبکہ وہ انہی پتھروں پر سیدھا لیٹ کر آنکھیں بند کر گیا تھا۔

♥ ♡ ♥

وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ ایک نظر سوئی ہوئی فضا پر ڈالی تھی۔ جو گہری نیند سو رہی تھی۔ رسٹ واچ اتار کر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی تھی پھر شرٹ کے بٹن کھولنے لگا تھا۔ اے سی کی کولنگ سے کمرہ کافی حد تک یخ ہو چکا تھا۔ مڑ کر وہ کمرے سے نکلا تھا۔ اس کا کمرہ سیکنڈ فلور پر تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر رہا تھا جب اسے مہرین نظر آئی تھی۔

"مہرین" اس نے اسے پکارا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں غالباً "اسٹڈی روم سے آ رہی تھی۔

"جی بھائی۔" اس کی آواز پر وہ رکتی ہوئی بولی تھی۔

"زائرہ کو بلاؤ۔"

"جی۔" کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی جو ان بہنوں کا مشترکہ تھا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آیا تھا۔ بیڈ کے کنارے بیٹھ کر وہ اپنے جوتے اتارنے لگا تھا۔ جوتے بیڈ کے نیچے رکھ کر وہ ٹانگیں بیڈ سے لٹکائے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ آنکھیں بند کیے وہ کچھ پل خود کو ریلیکس کرنے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے اندر آئی تھی۔ آہٹ پر وہ چونک کر اسے کپڑے نکالنے کو کہہ گیا تھا۔ وارڈروب سے اس کے کپڑے نکال کر واش روم میں رکھ آئی تھی۔ وہ اٹھ کر کپڑے چینج کرنے چلا گیا تھا۔ کپڑے بدل کر وہ کچن میں آیا تھا۔ وہ اس کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا چکی تھی۔ اسے کھانا شروع کرتے دیکھ کر وہ بولی تھی۔

"میں آنٹی کو میڈیسن دے کر آتی ہوں۔" وہ چلی گئی تھی کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آیا تھا۔ بستر پر دراز وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا آہٹ پر اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ ماں کو اپنے پاس بیٹھتا دیکھ کر وہ بھی بیٹھ گیا تھا۔

"زائرہ کو سمجھاؤ کہ وہ بلقیس اور اس کی بیٹیوں کی آیا گیری نہ کرے۔ اس کی خدمت کے لیے لے کر نہیں آئی میں اسے۔ جب دیکھو ان کے کمرے میں گھسی ان سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس کی اچھی باتوں کو تو نہیں پھیلائیں گی پر ایک غلط بات منہ سے نکلے تو اس کا ڈھنڈورا وہ اور اس کی بیٹیاں پیٹیں گی۔" پھر وہ مزید بھی بہت کچھ کہتی رہی تھیں۔ جس پر وہ مزید چپ نہیں رہ سکا تھا بول اٹھا تھا۔

"اگر ان کی خدمت کرتی ہے تو اس میں میرا نہیں خیال کہ کوئی برائی ہے۔ اگر وہ ان سے ہنس بول لیتی ہے تو اس میں بھی برائی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ چچی اور ان کی بیٹیوں نے جتنی خدمت اس گھر والوں کی اور میری کی ہے۔ اگر اس کے بدلے میری بیوی ان کی خدمت کرتی ہے تو یہ آیا گیری نہیں کہلاتی۔ اچھائی کا بدلہ اچھائی کہلاتا ہے۔ آپ اسے منع مت کریں میں نے اسے کہہ رکھا ہے کہ وہ چچی اور ان کی بیٹیوں کا خیال رکھے۔ جتنی خدمت چچی میری کر چکی ہیں۔ اگر اس کے بدلے میں میں اپنی بیوی سے ان کی خدمت کرواتا ہوں تو یہ ہرگز بری بات نہیں ہے۔ میں اپنے حق میں اس کی ہر کوتاہی برداشت کر سکتا ہوں پر ان کے معاملے میں ہرگز نہیں۔ یہ میں اسے باور کرا چکا ہوں۔ اگر آپ اسے روکتی ہیں تو اس کا مطلب اسے میری مخالفت میں کھڑا کرنا ہے۔ میری مخالفت کا جو نتیجہ نکلتا ہے اس سے وہ بخوبی آگاہ ہے۔ وہ آپ کی بات نہیں سنے گی۔ اس لیے اسے مت روکیں۔ اسے میری ہدایت پر عمل کرنے دیں۔" آج وہ کھل کر صاف اور واضح الفاظ میں انہیں دو ٹوک بات کر گیا تھا۔

اس کی باتوں پر ماں کی تیوری چڑھی تھی۔ ان کے چہرے پر ناگوار تاثرات کے اتار چڑھاؤ کو وہ بخوبی دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ ان تاثرات کو کوئی اہمیت دینے والا نہیں تھا۔ اس کی ماں مزید بنا کچھ کہے اٹھ کر چلی گئی۔ شادی کے بعد سے لے کر آج تک وہ یہی جملے سنتا رہا تھا۔ جسے وہ ٹال دیتا تھا۔ لیکن آج وہ مزید برداشت نہیں کر پایا تھا۔ اس لیے جو کچھ سوچ رہا تھا وہ بول رہا تھا۔ ماں کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر آنکھیں بند کیے لیٹ گیا تھا۔ جانے کتنی دیر تک وہ اسی کیفیت میں لیٹا رہا تھا۔ سوچ کی وادی سے وہ تب نکلا تھا۔ جب اس نے

اپنے بالوں میں اس کے نرم و ملائم ہاتھ کی انگلیاں چلتی محسوس کی تھیں۔ وہ یونہی لیٹا رہا تھا۔ وہ اس سے بے تحاشا محبت کرتی تھی اس لیے وہی کرتی تھی جو وہ کہتا تھا۔

"یقیناً" اللہ نے میرے گناہ معاف کر دیے ہیں کہ انعام کے طور پر مجھے اس قدر اچھی بیوی سے نوازا۔" وہ سوچ رہا تھا۔ شوہر بیوی سے فرمانبرداری چاہتا ہے وہ خوش تھا کہ اسے ایک فرمانبردار بیوی ملی تھی۔ وہ عباس کو سوچنے لگا تھا۔ عباس اس سے اپنا ہر ناطہ توڑ چکا تھا اسے دیکھ کر وہ یوں نظریں پھیر لیتا تھا جیسے اسے جانتا تک نہ ہو۔ وہ ہر نماز میں اس کے لوٹ آنے کی دعا کرتا تھا۔ اس نے دوستی کو اس لڑکی پر قربان کر دیا تھا۔ لیکن دوست کی محبت اب بھی اس کے دل میں موجود تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔ اور وہ اس کی طرف لوٹ کر آئے گا۔

"کاش کہ ایسا ہو۔" وہ سوچ رہا تھا۔ ریشمی، ملائم انگلیاں اب بھی دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں چل رہی تھیں۔ یکدم سے لائٹ چلی گئی تھی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا ہو گیا تھا۔ وہ چلانے لگی تھی۔ وہ عجلت سے اٹھ کر سائیڈ ٹیبل کی دراز سے ٹارچ نکال کر روشن کر چکا تھا۔

"ریلیکس۔" ٹارچ کے روشن ہوتے ہی وہ خاموش ہوئی تھی۔ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر وہ اس کے چہرے پر چھائے خوف کی کیفیت کا جائزہ لیتے ہوئے اسے تسلی دینے لگا تھا۔ یکدم سے لائٹ آ گئی تھی۔ ٹارچ آف کر کے وہ رکھنے کے بعد پھر سے لیٹ گیا تھا۔ جبکہ وہ نارمل ہو چکی تھی۔ کچھ پل کی طویل خاموشی کے بعد وہ سابقہ انداز میں بولنے لگی تھی۔

"میں پانچ دنوں کے لیے جا رہی ہوں۔" صبح وہ ماں کے گھر جانے والی تھی وہ اسے اپنے جانے کا بتا چکی تھی لیکن یہ بتانا بھول گئی تھی کہ کتنے دنوں کے لیے جا رہی ہے۔

"دو دن کافی ہیں۔" دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"پانچ دنوں کے لیے جا رہی ہوں میں۔ اتنے عرصے بعد جا رہی ہوں کم از کم پانچ دن تو ہونے چاہئیں۔" اس نے شکوہ کناں نگاہوں سے تکتے ہوئے کہا تھا۔

"کہا نا دو دن کے لیے۔"

"کیوں؟" وہ زچ ہو کر کہہ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ پھر وہ خود ہی بولی تھی۔

"دو دن کا کہہ رہے ہو۔ ایک دن پہلے ہی لینے چلے آؤ گے۔" اسے اس کی عادت کا پتہ تھا وہ ایسا ہی کرتا تھا۔ جتنے دن کے اجازت دیتا تھا اس سے پہلے ہی لینے جا پہنچتا تھا۔

"پرامس اب کی بار ٹھیک دو دن بعد ہی آؤں گا۔" اس نے یقین دلانا چاہا تھا۔

"مجھے یقین نہیں۔" وہ اس کی نیند سے بوجھل آنکھوں کو بے یقینی سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ نیند کا غلبہ ہونے لگا تھا۔

"کہو نا کتنے دن۔"

"دو دن۔" وہ اپنی بات پر ڈٹا تھا۔

"دو دن کیوں پانچ دن کیوں نہیں؟" وہ اس سے الجھ پڑی تھی۔

"اس لیے کہ یازان تم کو بہت چاہتا ہے اور تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اپنے دل پر رکھتے ہوئے وہ بہت گمبھیر آواز میں کہہ رہا تھا۔ اس کی بات کے جواب میں وہ دھیمے سے مسکرا کر اپنا ہاتھ چھڑا کر اٹھتے ہوئے بولی تھی۔

"کیا بہانہ بنایا ہے مجھے بے وقوف بنانے کا۔" وہ بیگ تیار کرنے چل دی تھی۔ جبکہ نیند سے بوجھل آنکھیں بند کر کے وہ دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔

♥ ♡